رسل کے رومان

ترجمہ و ترتیب

عابد میر

LOVE AFFAIRS OF

Bertrand Russell

رسل کے رُومان

ترجمہ و ترتیب: عابد میر

BOOK TIME
Urdu Bazar, Karachi
booktime786@gmail.com

ادارہ Book Time کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیشِ نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

کتاب :رسل کے رومان

ترجمہ و ترتیب::عابد میر

قیمت : -/200روپے

پبلشر : بک ٹائم

رسل کی محبوباؤں کے نام

"تین سادہ مگر پر جوش جذبے میری زندگی پر طاری رہے ہیں؛

• محبت کی تلاش

• علم کی جستجو

• انسانی مصائب کے لئے بے کراں درد......"

—رسل

فہرست

پیش لفظ	7
میرا مقصدِ حیات رسل	15
پہلی محبت ایلس	16
ایک بوسے کی تمنا ہیلن	32
ہچکچاہٹ کا تعلق سیلی فیر چائلڈ	33
عشقِ جنوں خیز اوٹولن	34
سعیِ ناتمام جرمن دوشیزہ	70
ہزاروں خواہشیں امریکی حسینہ	71
حسنِ بلاخیز کولٹی	74

دوسری بیوی	84
ڈورا بلیک	
تیسری شادی	95
پیٹر سپینس	
آخری عشق	96
ایڈتھ فنچ	
ایک نظم	104
ایڈتھ کے نام	
آخری بات	106
رسل کے افکار	111

پیش لفظ

مارکس کا یہ مشہورِ زمانہ فقرہ بھلا ہم میں سے کس نے نہ سنا ہوگا کہ، فلسفیوں نے آج تک محض دنیا کی تشریح کی ہے، حالانکہ ضرورت اسے بدلنے کی ہے۔ رسل ان چند فلسفیوں میں سے ہے جس نے صرف اپنی تحریر ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی اس دنیا کو بدلنے کی ہر ممکن سعی کی، لیکن افسوس کہ اس کے باوجود مارکسیوں کے ہاں وہ سب سے زیادہ نظر انداز کیے جانے والا فلسفی رہا۔ شاید صرف اس لئے کہ نہ تو مارکسیوں کی قائم کردہ خودساختہ جنت (سوویت) اسے متاثر کر سکی، نہ ہی مارکسزم کو وہ ایک سکول آف تھاٹ کے بطور کلی طور پر قبول کر سکا۔ حالانکہ عملی طور پر وہ کئی مارکسوادیوں سے زیادہ باعمل رہا۔

میں خود فلسفے کے مطالعے کے دوران رسل کے افکار سے جستہ جستہ استفادہ تو کرتا رہا، لیکن بطور مجموعی اُس کے فکری نظام سے آشنا نہ تھا۔ اس کا ایک سبب شاید مارکسی سکول سے وابستگی کے باعث مخصوص مطالعے کی عادت بھی تھی۔ کٹر مذہبیوں کی طرح ہمیں بھی بزرگوں کی طرف سے بتایا جاتا ہے کہ کس کو پڑھنے سے 'اپنے علم' میں اضافہ ہوگا اور کسے پڑھنے سے 'ایمان' خطرے میں پڑ سکتا

ہے۔کون 'شریعت' کے مطابق لکھتا ہے،اور کون 'بدعتی' ہے۔رسل کو پڑھنے کے لئے کبھی کسی بزرگ، کسی ساتھی کی جانب سے کوئی تحریک نہ ملی۔اور اس کا جستہ جستہ مطالعہ اس کے فکری نظام کی طرف رغبت کا باعث نہ بن سکا،تاوقتیکہ اس کی سوانح عمری سے میرا پالا نہ پڑا۔

سوانح عمریاں میرے مطالعے کی دلچسپی کا محور ہونے کے باوجود یہ کتاب ایک عرصے تک میری توجہ اس لئے بھی حاصل نہ کرسکی کہ اول تو اس کی ضخامت اسے شروع کرنے میں اکثر آڑے آجاتی۔دوم،اکثر میں یہ سوچ کر اسے پرے رکھ دیتا کہ ایک فلسفی اور ریاضی دان،نیز برطانیہ کے اشرافیہ خاندان سے تعلق رکھنے والے فرد کی سوانح عمری میں دلچسپی کا مواد بھلا کتنا ہوگا۔وہ تو بھلا ہو اردو میں ان کی تین ضخیم جلدوں کو تلخیص کے ساتھ ترجمہ کرنے والے قاضی جاوید کا جنہوں نے اس جانب مائل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔بلاشبہ قاضی جاوید کا یہ ترجمہ نہایت سہل،رواں اور آسان فہم ہے۔جو رسل کی انگریزی میں شائع شدہ ضخیم سوانح عمری کا بھرپور خاکہ پیش کرتا ہے۔لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ اسی تلخیص نے مجھے اس ضخیم کتاب کو پڑھنے کی جانب مائل کیا،جس سے میں ایک عرصے سے بوجوہ کنی کتراتا آیا تھا۔ایک عرصے تک میں اس کتاب کے سحر میں رہا۔اختتام تک یہ ضخیم کتاب میری چند پسندیدہ کتابوں میں شامل ہوچکی تھی۔سچ یہ ہے کہ رسل کی ایسی ہی ضخیم اور اہم ترین تخلیقی کاموں میں سے ایک،''مغربی فلسفہ کی تاریخ'' سے کہیں زیادہ متاثر کن ثابت ہوئی،اس کی یہ سوانح عمری۔

میرے لئے رسل کی شخصیت کئی حوالوں سے حیران کن ثابت ہوئی۔مثلاً مارکسیوں کے نزدیک اس کی شخصیت کے جس پہلو کے باعث وہ راندۂ درگاہ قرار پایا،اسی نے مجھے اس کے سب سے زیادہ قریب کیا،یعنی؛تشکیک پسندی۔رسل نے علم کے ساتھ تشکیک کو نتھی کرکے گویا کسی بھی علم کو الوہیت کے درجے تک پہنچنے سے روک دیا۔خواہ وہ کسی عقیدے کا علم ہو یا کسی نظریے کا۔یہ ایک ایسا پہلو ہے جو کسی بھی حقیقی علم دوست کے لئے کشش کا باعث ہوسکتا ہے۔تشکیک پسندی،تنقیدی صلاحیت کو جلا بخشتی ہے۔یہ عقلِ کل ہونے کے دعوے سے بچاتی ہے۔یہ تقلید کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔یہ کسی بھی علم دوست کی بنیادی پہچان ہے۔

دوسری طرف رسل کے جستہ جستہ مطالعے سے اس کا جو خاکہ بنا ہوا تھا، اس کی سوانح عمری میں وہ اس کے بالکل ہی برعکس ثابت ہوا۔ فلسفے جیسے اَدق مضمون پر لکھتے ہوئے اس کی تحریر کا بھاری پن سمجھ آتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک زبردست ریاضی دان بھی تھا۔ بلکہ اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ فلسفہ سے بڑھ کر ریاضی اس کی محبوبہ تھی، اس لئے اس ایک فلسفی اور ریاضی دان کا عمومی خاکہ یہی بنتا تھا کہ وہ ایک خشک ذہن اور کثیف مزاج کا حامل ہوگا۔ جمالیاتی ذوق کی توقع اس سے عبث ہو گی۔ اس لئے اس کی زبانی یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں شاعری بھی کی اور چند کہانیاں بھی لکھیں۔ اور پھر لگ بھگ نصف درجن شادیوں سمیت ایک درجن معاشقے اس کے جمالیاتی ذوق کا بھرپور ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ بالخصوص اس کے محبت نامے ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک شہرت یافتہ فلسفی اور ایک زبردست ریاضی دان جب عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کا لہجہ بالکل کسی ٹین ایجر سے مشابہہ ہو جاتا ہے۔ ایک ہی خط میں آپ دیکھتے ہیں کہ علم کی بات کرتے ہوئے وہ کیسے زبردست مدلل گفتگو کر رہا ہے، اور پھر جیسے ہی بات حسن کی محبوبہ کی اور اظہارِ محبت کی ہو تو ایک دم اس کے اسلوب پر کسی کالج یا یونیورسٹی کے طالب علم کی تحریر کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ وہ پہلو تھا جس نے مجھے رسل کے مزید قریب کر دیا۔

اس ترجمے کا قضیہ بھی دلچسپ تھا۔ میں ان دنوں دراصل عالمی شہرت یافتہ لکھاریوں، فلسفیوں اور سیاستدانوں کے محبت نامے جمع کر رہا تھا۔ اسی دوران مجھے رسل کے اوٹولن کے نام لکھے گئے خطوط ہاتھ آئے۔ اب اتفاق سے میں انہی دنوں رسل کی اردو میں ترجمہ شدہ سوانح عمری پڑھ چکا تھا، لیکن یہ خطوط اس میں کہیں شامل نہ تھے۔ حالانکہ یہ رسل کی تحریر اور اس کے جمالیاتی ذوق کا ایک شہکار تھے۔ خدا جانے اردو کے ترجمہ نگار نے انہیں شامل کرنا کیوں ضروری نہیں سمجھا۔ یہی خطوط مجھے اس کی انگریزی میں شائع ہونے والی اصل کتاب An Autobiography of Burtrenf Russel کے مطالعے کی جانب لے جانے کا ایک اور اہم محرک ثابت ہوئے۔ جہاں رسل کے عشق کی داستانیں ہر صفحے پہ بکھری ہوئی تھیں۔ یہ زبردست فلسفی ایک کے بعد

ایک عشق کرتا چلا جاتا ہے، اور پنی تکمیل کی جانب رواں رہتا ہے۔ یہیں سے مجھے رسل کی شخصیت کے بالخصوص اس پہلو کو سامنے لانے کا خیال آیا۔ اس کے پیچھے ظاہر ہے کہ کچھ اسباب اور بھی تھے۔

ہم جس سماج کا حصہ ہیں، وہاں اول تو بظاہر عشق، محبت جیسے جذبات کو ہی فسق و فجور کی جڑ قرار دیا جاتا ہے۔ جو دو چار رومانوی لوک داستانیں مروج ہیں، انہیں بھی عشقِ حقیقی سے جوڑ کر اصل مقصد کو ہی مار دیا جاتا ہے۔ ہماری تربیت کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ سماجی سطح پر ایک کامیاب انسان بننے کے لئے ان جذبات کو دبائے رکھنا اور ان سے صرف نظر کرنا انسانی فریضے کا گویا ناگزیر حصہ ہے۔ دوسری طرف اب ایک عرصے سے ٹیکنالوجی کے سیلاب نے جونئی نسل جنم دی ہے، اس کے ہاں عشق و محبت کا مفہوم ہی بدل چکا ہے۔ یہ محض جنسی تلذذ کا نام ہے یا پھر تضیع اوقات۔ جبکہ رسل کے معاشقے اس آفاقی جذبے کے کئی اچھوتے پہلوؤں سے ہمیں آشنا کرواتے ہیں۔

ان میں ایک اہم بات اس مغالطے سے پردہ اٹھاتا ہے کہ محبت صرف ایک بار ہی ہو سکتی ہے۔ یہ کسی کا انفرادی تجربہ یا خیال تو ہو سکتا ہے لیکن اسے ایک آفاقی قانون کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ رسل کے علاوہ بھی اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ دوسرا اہم مغالطہ یہ ہے کہ پہلی محبت ہی یادگار ہوتی ہے۔ رسل کے ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا زوردار عشق، دوسری محبت کی صورت میں ہوا۔ پہلی محبت ایلس، اس کی بیوی بنی جس سے پندرہ برس سے زائد عرصے تک اس کا تعلق رہا۔ لیکن جو جنون، وارفتگی اور دیوانگی ہمیں اس کی دوسری محبت، اوٹولن کے نظر آتی ہے، وہ نہ صرف پہلی محبت بلکہ اس کے بعد کے معاشقوں میں بھی مفقود ہے، جس کا اعتراف رسل نے خود بھی کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اوٹولن نہ تو کوئی کنواری دوشیزہ تھی اور نہ ہی وہ اس سے پہلی نظر والی یوٹو پیائی محبت میں گرفتار ہوا، نہ ہی دونوں میں مکمل فکری ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ اوٹولن، رسل کے ایک دوست کی بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی، جب ان دونوں کی ملاقات ہوئی، جو جلد ہی شدید باہمی محبت میں بدل گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوٹولن کی جانب رسل کی رغبت کا ایک سبب اس کے پہلی بیوی ایلس سے بگڑتے ہوئے

تعلقات اور سات سالہ نفس کشی بھی تھی۔ لیکن معاملہ صرف یہاں تک محدود نہیں تھا، جیسے کہ اس کے خطوط سے بھی ظاہر ہے۔ اس نے اوٹولن کو پانے کے لئے ایلس سے طلاق بھی لے لی، لیکن دوسری طرف اوٹولن کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ وہ رسل کے ساتھ تعلقات تو برقرار رکھنا چاہتی تھی لیکن اپنے شوہر اور بچوں سے قطع تعلق اسے منظور نہ تھا۔ جس نے بالآخر رسل کو اس سے بدظن کر دیا، لیکن رسل کے بقول ان کے مابین دوستانی تعلقات اوٹولن کی موت تک برقرار رہے۔

رسل کے اس عشق کا قصہ ہمیں بتاتا ہے کہ محبت کی مسرت ایک تخلیق کار کی تخلیقی صلاحیتوں کو کیونکر جلا بخشتی ہے۔ یہ وہ طوفانی جذبہ ہے جو عمر، رنگ، نسل، طبقات سمیت کسی بھی تفریق سے بالاتر ہو کر دو انسانوں کو باطنی مسرت سے سرشار کر دیتا ہے۔ رسل کی مانند اوٹولن بھی اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھی، لیکن دونوں عمر بھر اپنے آبائی تعارف سے پیچھا چھڑاتے رہے۔ دونوں نے اپنی خاندانی شناخت ترک کی۔ دونوں نے سماجی ضابطوں کی پرواہ کیے بغیر ایک دوسرے سے محبت کی مئے کشید کی۔ اس پر نہ تو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا، نہ کسی قسم کی ندامت کا شکار ہوئے۔ دونوں نے جس احترام اور محبت سے ایک دوسرے کو اپنایا تھا، اسی باہمی احترام سے اس تعلق کو قطع کیا، لیکن عمر کے آخری حصے تک سماجی تعلق داری نبھاتے رہے۔

دوسری طرف ہمارے ہاں کا تخلیق کار اس جذبے سے متعلق عجب گومگوں کیفیت کا شکار ہے۔ اول تو ہمارے ہاں کے سماجی ضابطے عام فرد سے لے کر کسی تخلیق کار کے لئے یہ گنجائش ہی نہیں رکھتے کہ وہ آزادانہ طور پر اس جذبے سے لطف اندوز ہو سکیں۔ زور زبردستی کی اس کیفیت نے اس جذبے کو جنسی ہیجان کی علامت بنا دیا ہے۔ ہمارا تخلیق کار، ایک عام فرد کی طرح کسی بھی عورت کا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایکسرے تو لے سکتا ہے، لیکن اسے ایک فکری ساتھی کے بطور دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خوش ونت سنگھ جیسے لکھاریوں کی تحریریں تو ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں جو اپنی زندگی مین آنے والی خواتین کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتے ہیں، لیکن ایک فکری ساتھی کی تلاش مین ماری جانے والی سارہ شگفتہ جنسی پیچیدگیوں کا شکار کہلاتی ہے۔

اس پر طرہ یہ کہ ہمیں مغرب پہ اپنی برتری کا زعم بھی ہے۔ دوسری طرف 'بدنصیب اور بے راہ رو مغرب' کو دیکھئے تو علم و دانش کے اعلیٰ ترین مراکز وا ذہان وہیں نظر آتے ہیں۔ جب سے انہوں نے کسی تصوراتی جنت کا خیال چھوڑ کر اس دنیا کو جنت بنانے کی ٹھانی ہے، ہم انہیں مسلسل عروج کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ سماج ہیں جہاں فرد کی آزادی، عقائد سمیت تمام سماجی ضابطوں سے برتر ہے۔ اور ظاہر ہے جہاں ایک فرد کو یہ یقین ہو کہ اس کے افکار اور اس کی نجی زندگی کے افعال، کسی مذہبی یا ریاستی پہرہ داری سے آزاد ہیں، تب ہی اس کی تخلیقی صلاحیتیں کسی خوف اور ڈر کے بنا پنپتی ہیں، اور سماج کو بطور مجموعی فائدہ پہنچاتی ہیں۔

اس سے مراد یہ نہیں کہ مغربی معاشرہ ایک آئیڈیل سماج ہے اور ساری برائیوں کی جڑ مشرق ہے۔ لیکن آخر یہ سوچنے میں کیا برائی ہے کہ کیا وجہ ہے کہ علم کے تمام مراکز اور اعلیٰ ذہن انہی کے ہاں پیدا ہو رہے ہیں، جنہیں ہم نے نالائق، بے راہ رو اور جہنمی قرار دیا ہوا ہے! جنہوں نے سماجی ضابطوں کو الہام کا درجہ نہیں دیا، بلکہ افراد کی سہولت کے لئے ان میں رد و بدل کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ جو محبت کرنے اور کیے جانے پر پشیمان نہیں ہوتے۔ کسی کے ساتھ سونے اور نہ سونے کا معاملہ ان کی راتوں کی نیندیں حرام نہیں کرتا، بلکہ ہر قلبی تعلق ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ یہ نسلِ انسانی کو آگے بڑھانے یعنی اولاد پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی بہ حسن و خوبی نبھاتے ہیں اور ساتھ ہی انسانوں کی اس دنیا کو انسانوں کے لئے مزید سہل بنانے کے جتن بھی کرتے رہتے ہیں۔

اِدھر ہم ہیں، جو عمر بھر سماجی ضابطوں کے خوف میں گھرے رہتے ہیں۔ ہم اپنی جائز خواہشات کے حصول سے بھی بعض اوقات محض اس لئے دستبردار ہو جاتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے، زمانہ کیا کہے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سرعام رشوت لیتے ہوئے، لوگوں کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے، دوستوں کو دھوکہ دیتے ہوئے، طوائف بازی کرتے ہوئے، کسی کا حق مارتے ہوئے، ہم بھی یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ لوگ کیا کہیں گے، زمانہ کیا کہے گا! لیکن محبت کرتے ہوئے، دو افراد کے مابین

محبت کو پروان چڑھتا دیکھ کر، اپنی مرضی کا لباس زیب تن کرتے ہوئے، اپنے بچوں کی ان کی پسند سے شادی طے کرتے ہوئے، ہمارا اولین سوال ہوتا ہے، لوگ کیا کہیں گے، زمانہ کیا کہے گا!

اس کھلی دوغلیت نے ہمیں اخلاقی پستیوں کی اتھاہ کھائیوں میں گرا دیا ہے۔ جس سے افراد کی تخلیقی صلاحیتیں بھی دن بدن کمزور پڑتی جا رہی ہیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہے ہمارے پاس ان تمام اخلاقی جرائم کا جواز بھی موجود ہے۔ یہ سدابہار نسخہ آپ ہر پاک مومن سے لے کر کمزور ایمان حضرات کے منہ سے بھی نہایت تاسف کے ساتھ سنیں گے، ہماری تمام برائیوں کی جڑ مذہب سے دوری ہے۔ گویا کوئی ہم پہ ڈنڈا لے کے کھڑا ہے کہ اگر مذہب کے قریب بھی پھٹکے تو جان سے مار دوں گا۔ پھر اگر چلیئے مروتاً اس جواز کو مان بھی لیا جائے تو یہ اہلِ مغرب کیوں دن بدن عروج حاصل کرتے جا رہے ہیں جنہوں نے ایک عرصہ ہوا کہ مذہب کو دیس نکالا دے دیا ہے؟! یہ سادہ سی بات سمجھنے کے لئے جانے ہمیں کس اوتار کی ضرورت ہے کہ افراد کے نجی معاملات سے عقائد اور ریاست کی چوکیداری ختم کیئے بنا کوئی بھی معاشرہ شاندار تخلیقی جوہر کے حامل شہری، جادو کے زور پر بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ رسل نے جن تین جذبوں کو اپنا مقصدِ حیات گردانا ہے، (محبت کی تلاش، علم کی جستجو، انسانی مصائب کے لئے بے کراں درد) سماج کا ہر فرد اگر انہی نقاط کو حیات کا محور بنا لے تو وہ سماج انسانی فلاح کا اعلیٰ مرکز بن جائے۔ میں نے اس لئے بھی رسل کے رومان کے تذکروں سے قبل اس کی سوانح عمری میں پیش لفظ کے بطور شامل اس مختصر تحریر سمیت آخری باب کا ترجمہ شامل کرنا ضروری سمجھا، جس میں اس نے اپنی زندگی اور افکار کا بھرپور اور مختصر ترین خاکہ بیان کر دیا ہے۔ یہ مختصر تحریریں اس کی ضخیم سوانح عمری کا گویا نچوڑ ہیں۔

اسی طرح اس کے رومان کے تذکروں سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ عمر بھر عشق و محبت کے چکروں میں الجھا رہا، بلکہ جیسا پہلے بھی کہا گیا کہ یہ تعلقات تو محض اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے لئے مہمیز کا درجہ رکھتے تھے۔ واضح رہے کہ انہی بنتے بگڑتے تعلقات کے دوران اس نے اپنا فکری کام بھی جاری رکھا اور اسی پہ اُنیس سو پچاس کی دہائی میں ادبی دنیا کا سب سے بڑا انعام، نوبل پرائز بھی

جیتا۔ عمر کے آخری حصے میں بالخصوص وہ جنگ مخالف جدوجہد میں سرگرم رہا۔ نوبل پرائز کی رقم سے اس نے ایک فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی، جس نے دنیا بھر میں جنگوں کے خلاف مظاہرے کیے۔ ڈھلتی عمر اور بڑھاپے کے باوجود رسل جنگ مخالف مظاہروں میں بڑھ چڑھ کر شامل ہوتا رہا۔ دنیا بھر کے ادیبوں کو جنگ مخالف سرگرمیوں میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس ضمن میں اسے گرفتار ہو کر جیل بھی جانا پڑا۔ برطانوی اشرافیہ سے تعلق کے باوجود اس نے برطانیہ کے نوآبادیاتی کردار پہ نہ صرف کڑی تنقید کی بلکہ اس کے خلاف عملی جدوجہد میں بھی حصہ لیا۔ اسی لئے آخر میں، میں نے اس کی آپ بیتی کے آخری مختصر باب سمیت اس کے افکار سے چند شہ پاروں کو شامل کرنا بھی ضروری سمجھا، جو اس کی زندگی اور شخصیت کے خاکے کو کلی طور پر سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، اور جنھوں نے بلاشبہ مجھے شدید طور پر متاثر کیا، قارئین کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

اس کام میں، میں اردو کے ترجمہ سے بھی استفادہ کرتا رہا، لیکن 'اپنی دنیا آپ پیدا کر' کے مصداق اپنی محنت میں زیادہ لطف پایا۔ ممکن ہے میری کمزوری ترجمے میں کہیں حائل ہوئی ہو لیکن متن کے ساتھ میں نے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی، البتہ موضوع کی مناسبت سے تلخیص کے باعث تشنگی کا احساس کہیں کہیں خود مجھے بھی محسوس ہوا۔

یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ ہم انہی چیزوں پہ محنت کرتے ہیں جن میں کچھ اپنائیت، کچھ اپنا عکس محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس ترجمے کے پیچھے اس سے زیادہ اور کوئی مقصد کارفرما نہیں کہ ہم اپنے سماج میں کچھ ایسی کتابوں کو فروغ دے پائیں جن سے افراد کو 'محبت کی تلاش، علم کی جستجو اور انسانی مصائب کے لئے بے کراں درد محسوس کرنے' کی مہمیز مل سکے!

عابد میر

۱۵ نومبر ۲۰۱۱ء، شال

میرا مقصدِ حیات

تین سادہ مگر پرجوش جذبے میری زندگی پر طاری رہے ہیں؛

• محبت کی تلاش

• علم کی جستجو

• انسانی مصائب کے لئے بے کراں درد

یہ تینوں جذبے بادوباراں کی مانند میری زندگی کی کشتی کو کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر دھکیلتے رہے۔

محبت کی تلاش میں نے اس لئے کی کہ یہ سرور آمیز ہے۔ اس قدر سرور آمیز کہ اس سے کشید کی ہوئی مسرت کے چند لمحوں کے لئے میں پوری زندگی دے دوں۔ محبت کو میں نے اس لئے بھی پانا چاہا کہ یہ تنہائی کے احساس کو مٹا دیتی ہے۔ وہ جان لیوا تنہائی، جس میں لرزتا، کپکپاتا شعور، سرد، بے کراں اور زندگی سے بے بہرہ اتھاہ گہرائیوں میں کائنات کے آخری سروں تک جا پہنچتا ہے۔ سو، میں نے محبت کی آرزو کی اور اسے پالیا۔

اتنی ہی شدت سے میں نے علم کی جستجو کی۔ میں نے انسانوں کے دلوں کا جاننا چاہا اور ستاروں کے چمکنے کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس فیثا غورثی علم کو بھی حاصل کرنا چاہا، جس کی رُو سے عدد، تغیر پزیر نہیں ہوتے۔ اگرچہ زیادہ نہ سہی، اس کا ایک حصہ میں نے ضرور پایا۔

محبت اور علم مجھے آسمانی رفعتوں کی جانب لے جاتے تھے۔ لیکن ہر بار انسانی مصائب مجھے واپس زمین پہ لے آتے۔ درد کی صدائے بازگشت میرے دل پر نقش ہو جاتی۔ قحط زدہ بچے، فاتحین کے ستم رسیدہ، اولاد کے لئے بیزار کن بوجھ بنے ہوئے بے بس بوڑھے، تنہائی، مفلسی، اور مصائب کی ماری دنیا، میرے آدرشی خیالات اور تصوراتی دنیا کا مذاق اڑاتی۔ میں برائی کو کم کرنا چاہتا ہوں، مگر کر نہیں پاتا، سوا اپنے لئے نقصان کماتا ہوں۔

یہی میری زندگی رہی ہے۔ اس سب کے باوجود میں نے اسے زندہ رہنے کے قابل پایا ہے۔ اگر مجھے پھر سے موقع ملے تو میں اسے بخوشی گزارنا پسند کروں گا۔

برٹرینڈ رسل

پہلی محبت..........ایلس

1889ء کی گرمیوں میں، میں ہینڈ لینڈ میں چچا رولا کے ہاں رہائش پذیر تھا۔ ایک اتوار پہ ہم لمبی سیر کو گئے۔ فرہرسٹ کے قریب ایک پہاڑی سے اترتے ہوئے انہوں نے بتایا، ''سامنے والے مکان میں نئے لوگ آئے ہیں، آؤ ان سے مل ملیں۔'' اپنے روایتی شرمیلے پن کے باعث مجھے یہ خیال پسند نہیں آیا اور میں نے چچا سے کہا کہ فقط علیک سلیک کر کے واپس ہوں گے، شام کے کھانے تک نہیں رکیں گے۔ فوری طور پر تو وہ مان گئے لیکن وہاں جا کر وہ یہ بات بھول ہی گئے۔

وہ پیر سال سمتھ نام کا ایک امریکی خاندان تھا۔ جس میں ایک بوڑھے میاں بیوی کے علاوہ ،ان کی ایک بیٹی، اس کا شوہر اور ایک چھوٹی بیٹی بھی تھی، جو برم ماور میں پڑھتی تھی اور چھٹیاں گذارنے آئی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔ میاں بیوی اپنے زمانے کے معروف مبلغ رہے تھے۔ میاں ایک بار ایک نوجوان عورت کو چومتے ہوئے پکڑا گیا، اس کا ایک اسکینڈل بن گیا، جس کے بعد وہ مذہب سے بھی بددل ہو گیا۔ بہرحال، جب ہم نے انہیں دیکھا تو دونوں میاں بیوی خاصے ضعیف ہو چکے تھے۔

ان کے داماد کا نام کوسٹیلو تھا۔ یہ ایک معاملہ فہم آدمی تھا۔ وہ لندن کاؤنٹی کونسل کا رکن اور ایک ریڈیکل تھا۔ وہ ان دنوں گودی کے مزدوروں کی جاری ہڑتال سے تازہ متعلق خبریں لے کر ابھی ابھی لندن سے آیا تھا۔ یہ ہڑتال نہایت دلچسپ اور اہم تھی۔ اس کے ذریعے پہلی بار ٹریڈ یونین ازم کو نہایت نچلی سطح تک سرایت کرنے کا موقع ملا تھا۔ رات کے کھانے پر جب وہ اس کا تذکرہ کر رہا تھا تو میں نے یہ خبریں بڑی توجہ سے سنیں۔ مجھے لگا کہ میں حقیقت سے قریب تر ہونے لگا ہوں۔ اس امریکی خاندان کا اکلوتا لڑکا بلیول میں زیر تعلیم تھا اور اس کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ اس قسم کے معاملات سے متعلق اچھی خاصی معلومات رکھتا تھا۔

بہر کیف، میری دلچسپی کا مرکز ان کی چھوٹی بیٹی، برن ماور سے آنے والی حسینہ تھی۔ وہ لاثانی حسن کی مالک تھی۔ اس واقعہ کے برسوں بعد 10 مئی 1921ء کے گلاسکو سے شائع ہونے والے روزنامہ 'بلیٹن' میں اسے یوں خراجِ تحسین پیش کیا گیا: "تقریباً بیس برس قبل ایڈنبرا کے ایک شہری استقبالیہ میں مسز برٹرینڈ رسل سے ہونی والی ملاقات آج بھی مجھے یاد ہے.........." ہوسکتا ہے یہ کسی اور تقریب کا ذکر ہو...... بہر حال وہ اس قدر حسین تھی کہ انسانی تخیل اس سے زیادہ حسن کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ اس میں ایک باوقار متانت تھی۔ ہم اس کی شخصیت اور حسن کے سحر سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ ہم سب نے اس شام اسے ایڈنبرا کے خصوصی انداز میں 'شام کی ملکہ' بنا دیا۔ وہ ایک آزاد ذہن کی مالک تھی۔ کالج میں زیر تعلیم تھی اور اکیلے ہی بحرِ اوقیانوس کا سفر کرتی رہتی تھی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ معروف امریکی ادیب والٹ وٹمین سے اس کی خاصی گہری دوستی تھی۔

اُس شام، اس حسینہ نے دوران گفتگو مجھ سے ایک جرمن کتاب (Ekkehard) سے متعلق پوچھا کہ کیا میں نے یہ کتاب پڑھی ہے۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ میں نے یہ کتاب اسی روز پڑھ کے ختم کی تھی۔ یہ اتفاق، خوش قسمتی کی علامت ثابت ہوا۔ اس نرم دل لڑکی نے میری جھجک دور کر دی۔ بلاشبہ، پہلی ہی نظر میں، میں اس کی محبت کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔

اس موسم گرما کے دوران مجھے اس خاندان کے کسی فرد سے دوبارہ ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ البتہ

بعدازاں جب بھی گرمیوں کی تعطیلات میں تین ماہ کے لئے میں چچا کے ہاں جاتا تو ہر اتوار کو چار میل پیدل سفر کر کے، اس کے گھر ضرور جاتا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت میں وہاں پہنچتا اور شام کی چائے تک وہیں ٹھہرتا۔ شام کے اوقات میں وہ لوگ جنگل میں کیمپ فائر کا الاؤ جلاتے اور اس کے گرد بیٹھ کر نیگرو رومانی گیت گاتے۔ اس وقت تک انگلینڈ میں یہ گیت نامعلوم تھے۔ گوئٹے کی طرح امریکہ مجھے بھی آزادی کا ایک رومان پرور دیس معلوم ہوتا تھا، اور یہ خاندان مجھے ایسے بہت سارے تعصبات سے پاک نظر آیا جنہوں نے میرے شعوری ارتقا کو روک رکھا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان کی آزاد فکری مجھے بہت بھاتی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس خاندان کی ایلس نامی اس دوشیزہ کے ساتھ میرا لگاؤ بڑھتا رہا۔ وہ اپنے بھائی لوگوں سے زیادہ سنجیدہ اور اپنی بہن مسز کوسٹیلو سے بہرحال کم غیر ذمہ دار تھی۔ وہ اس سادگی کا پیکر تھی، جس کا میں دلدادہ تھا۔ وہ خود پسندی اور تعصب سے کوسوں دور تھی۔ ایلس مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑی تھی۔ میں اکثر سوچتا کہ کیا وہ میرے 'بڑے' ہونے کا انتظار کر پائے گی! بظاہر ایسا مشکل نظر آتا تھا۔ بہرحال، میں نے اپنے تئیں طے کر لیا کہ اگر چند برس مزید اس نے شادی نہ کی اور یونہی کنواری رہی تو میں اس سے شادی کی درخواست ضرور کروں گا۔

اُن دنوں ایک بار میں ایلس اور اس کے بھائی کے ساتھ جج واگن ولیمز سے ملنے لیتھ ہل گیا۔ راستے میں ان دونوں بہن بھائی نے مجھ سے باتوں باتوں میں یہ اگلوا لیا کہ میں پہلی نظر میں محبت پہ یقین رکھتا ہوں۔ میرے اس اعتراف پر وہ مجھ سے چھیڑ خانی کرتے رہے۔ میں اس پہ خاصا آزردہ خاطر ہوا، کیونکہ میرے خیال میں ابھی اس خیال کی وضاحت کا وقت نہیں آیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری دادی اماں کے معیار کے مطابق ایلس 'معزز دوشیزہ' نہ تھی۔ گو کہ مجھے یہ لگتا تھا کہ وہ جین آسٹن کی الزبتھ بینٹ کی مانند ہے۔ اس خیال سے مجھے یک گونہ مسرت کا احساس ہوتا تھا۔

مئی 1893ء کو میں قانونی طور پر بالغ ہو چکا تھا۔ اسی دن سے ایلس کے ساتھ میری تعلقات کی نوعیت بدلنی شروع ہو گئی۔ اب میں محض اس کا ایک کم آمیز مداح نہ رہا تھا۔ اگلے ماہ میں

نے ریاضی میں اعلیٰ اعزاز حاصل کیا۔ یوں مجھے قانونی و مالی، ہر دو قسم کی خود مختاری مل گئی۔ انہی دنوں ایلس اپنی ایک کزن کے ساتھ کیمبرج آئی تو ہمیں پہلی بار کھل کر خوب باتیں کرنے کا موقع ملا۔ طویل چھٹیاں شروع ہوئیں تو وہ اسی کزن کے ساتھ دوبارہ آئی۔ اس بار اس کی کزن کے جانے کے بعد میں نے اسے ایک دن کے لئے روک لیا۔ ہم دونوں دریا کنارے آ گئے۔ دورانِ گفتگو طلاق کا معاملہ زیرِ بحث آیا۔ وہ مجھ سے بھی کہیں زیادہ طلاق کی حامی تھی۔ فکری طور پر وہ 'آزاد محبت' کو پسند کرتی تھی۔ حالانکہ میں اس معاملے میں خاصا سخت گیر واقع ہوا تھا، تاہم مجھے اس کی یہ بات پسند آئی۔ اس کے باوجود مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ ایلس اس بات پہ شرمندہ تھی کہ اس کی بہن نے آرٹ کے نقاد بیرنسن کے لئے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

ایلس کے دوسری بار کیمبرج آنے کے بعد میرا اس سے لگاؤ بڑھ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت شروع کر دی۔ ان دنوں میں نے ہیسلمر میں گرمیوں کی تعطیلات گزارنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چچا رولا کی دوسری بیوی کے ساتھ دادی اماں اور پھوپھی آگتھا کی ان بن ہو گئی تھی۔ بہرحال، 13 ستمبر 1893ء کو میں دو دن کے لئے فرائی ڈیز ہل چلا آیا۔ موسم گرم اور شاندار تھا۔ ہوا کی تیزی ختم ہو چکی تھی۔ صبح سویرے وادی میں دھند چھائی ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ لوگان نے ایک بار 'سنہری دھند' کے تذکرے پر شیلے کا مذاق اڑایا، اور میں نے یہ کہہ کر اسے آڑے ہاتھوں لیا کہ اس روز صبح اس کے جاگنے سے پہلے، دھند واقعی سونے کی طرح چمکدار تھی۔

اس روز میں نے ناشتے سے پہلے ایلس کے ساتھ سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ سیر کے دوران ہم ایک پہاڑی پر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ یہ کسی قدیم گوتھک کلیسا کی مانند دل فریب مقام تھا۔ درختوں کے درمیان سے چاروں اور کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ صبح روشن، تر و تازہ اور شبنمی تھی۔ ایسے میں، میں یونہی سوچنے لگا کہ شاید انسانی زندگی میں کسی مسرت کا وجود ہو۔ بہرحال، تب میری روایتی جھجک نے مجھے تخیل سے آگے بڑھنے نہ دیا۔

آخر کار ناشتے کے بعد خاصی ہچکچاہٹ اور دھڑکتے دل کے ساتھ، اس وقت کے رواج

کے مطابق میں نے شادی کی تجویز پیش کر ہی دی۔ فوری طور پر ایلس نے نہ تو مجھے قبول کیا اور نہ ہی مسترد کیا۔ مجھے بالکل خیال نہ آیا کہ مجھے اس کو چومنے یا اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تاہم ہم نے خط و کتابت اور میل جول جاری رکھنے پر اتفاق کیا تا کہ وقت خود ہی کوئی فیصلہ کر دے۔

یہ واقعہ گھر سے باہر پیش آیا تھا۔ جب ہم دوپہر کے کھانے کے لئے لوٹے تو ایلس کے لئے لیڈی ہنری سومرسٹ کا خط آیا ہوا تھا۔ لیڈی صاحبہ نے اس کو شکاگو کے عالمی میلے میں شرکت کی دعوت تھی تا کہ وہاں لوگوں کو میانہ روی کی تبلیغ کی جا سکے۔ ان دنوں امریکہ، اس خوبی سے خاصی حد تک محروم سمجھا جاتا تھا۔ ایلس نے اس معاملے میں اپنی والدہ سے ورثے میں پر جوش ایمان پایا تھا، اس لئے وہ اس دعوت سے نہایت مسرور ہوئی۔ اس نے فخریہ انداز میں دعوت نامہ پڑھ کر سنایا اور نہایت جوش و خروش سے دعوت قبول کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، تو میرے لئے اس میں خوشی کا کوئی پہلو نہ تھا، کیونکہ میرے لئے اس کا مطلب تھا، کئی مہینوں کا ہجر اور شاید کسی دلچسپ کیریئر کا آغاز۔

میں نے واپسی پر سارا معاملہ گھر والوں کے گوش گذار کیا۔ ان کا ردِعمل نہایت روایتی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایلس امرا طبقے سے نہیں ہے۔ وہ نچلے طبقے کی ایک مہم جو اور دوسروں کے بچے چھیننے والی ایک عورت ہے، اور یہ کہ اس نے میری 'معصومیت' اور 'ناتجربہ کاری' کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے یہ رقیق الزام بھی لگایا کہ وہ کسی قسم کے شائستہ احساسات سے عاری ایک ایسی عورت ہے جس کی سطحی حرکتیں میرے لئے خفت کا باعث بنتی رہیں گی۔ تاہم ان کی ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ والد کی جانب سے مجھے تقریباً بیس ہزار پونڈ کی رقم ورثے میں ملی تھی۔ یہ اچھی خاصی رقم تھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس معاملہ پر گھر والوں سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور شادی کے بعد تک کشیدہ ہی رہے۔

اس زمانے میں میرے پاس ایک ڈائری ہوا کرتی تھی جسے میں عام لوگوں سے عموماً بچا کر رکھتا تھا۔ اس ڈائری میں ایلس کے حوالے سے وادی کے ساتھ ہونے والی گفتگو اور اس سے متعلق

اپنے احساسات میں نے تفصیل سے لکھے تھے۔ کچھ عرصہ بعد والد کی ایک ڈائری میرے ہاتھ لگی، جس کے بعض اندر جات شارٹ ہینڈ میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا انہوں نے بعض باتیں دوسروں سے مخفی رکھنے کے لئے کیا ہوگا۔ بہر حال، اس ڈائری سے معلوم ہوا کہ والد نے بالکل میری ہی عمر میں، میری والدہ کو شادی کی پیشکش کی تھی۔ اور اس وقت بھی دادی نے بالکل وہی باتیں کہی تھیں جو انہوں نے میرے معاملے میں کہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز طور پر والد کا ردعمل بھی عین میرے جیسا ہی تھا۔ انہوں نے بھی میری طرح اپنے احساسات ڈائری میں درج کئے تھے۔ اس انکشاف سے ایک پُراسرار سا احساس میرے دل پر چھا گیا کہ میں اپنی زندگی بسر نہیں کر رہا بلکہ میرے روپ میں میرے باپ کی زندگی دہرائی جا رہی ہے۔ یوں وراثت میں ایک مافوق الفطرت اعتقاد پیدا ہو گیا۔

یہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ایلس سے شدید انسیت کے باوجود، تب تک میں اس کے ساتھ کسی جسمانی تعلق کی شعور خواہش نہ رکھتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک بار ایک جنسی خواب دیکھنے پر مجھے یوں لگا کہ جیسے میری محبت کی توہین ہوگئی ہو۔ بہر حال، آہستہ آہستہ فطری تقاضے خود کو منوانے لگے۔

دوسرا اہم واقعہ 4 جنوری 1894ء کو پیش آیا۔

اس روز میں ایلس سے ملنے اس کے گھر گیا۔ اس روز سخت برفانی طوفان آیا ہوا تھا۔ سارا لندن تقریباً چھ انچ موٹی برف کی تہہ میں ڈھکا ہوا تھا۔ مجھے واکس ہال سے، اس کے گھر تک پیدل جانا پڑا۔ برف نے تنہائی کا ایک عجیب سا ماحول پیدا کر دیا تھا، اور لندن کسی دُور افتادہ پہاڑی کی چوٹی کی طرح خاموش تھا۔ اس روز میں نے پہلی بار ایلس کا بوسہ لیا۔ اس سے پہلے صرف ایک بار میں نے اپنی ملازمہ کو چوما تھا۔ لہٰذا مجھے اندازہ ہی نہ تھا کہ محبوبہ کو چومنے میں کس قدر لذت پنہاں ہوتی ہے......! گو کہ ایلس کا کہنا تھا کہ اس نے شادی سے متعلق اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا، تاہم صبح سے رات تک سوائے کھانے کے وقفے اور کچھ دیر کے لئے ایک کتاب پڑھ کر سنانے کے، ہم نے سارا وقت بوس

وکنار میں گزارا۔ اس رات، میں برفانی طوفان میں سٹیشن سے ڈیڑھ میل پیدل چل کر تھکا ہارا لیکن ایک فرحت انگیز مسرت کے ساتھ گھر لوٹا۔

کیمبرج میں میری اگلی ٹرم کے دوران ایلس کے جذبات عجیب اتار چڑھاؤ کا شکار رہے۔ کبھی تو یوں لگتا کہ وہ مجھ سے شادی کے لئے مری جارہی ہے اور کبھی لگتا کہ وہ ابھی اپنی آزادی کو نہیں کھونا چاہتی۔ ان دنوں میں ایک سال میں اخلاقی علوم کے ٹرائی پوس کا دوسرا حصہ مکمل کر رہا تھا۔ سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ تاہم ایلس کی محبت کا یہ اتار چڑھاؤ میری ذہنی مشغولیت کو متاثر نہ کر سکا۔ ایسٹر کی چھٹیاں آئیں تو پہلے میں آنٹ ماور کے ساتھ چچا سے ملنے روم چلا گیا۔ وہاں سے پیرس آ گیا، جہاں لوگان نے ایک اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔ اس کی والدہ اور ایلس بھی قریب ہی رہائش پذیر تھیں۔ پیرس میں آرٹ کے امریکی طلبہ کی زندگی کو دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ ان کی زندگی مجھے آزاد اور مسرت انگیز لگی۔ مجھے ایک رقص بھی یاد ہے، جس میں ایلس نے راجر فرائے کا بنایا ہوا لباس پہن کر حصہ لیا تھا۔............ اس سیر و تفریح کے بعد میں کیمبرج واپس لوٹا تو جیمز وارڈ نے میرا دماغ کھا لیا کہ کام کرنے کی بجائے آخری چھٹیاں میں یورپ میں ضائع کر آیا ہوں۔ خیر، میں نے اس کی باتوں کا اثر نہ لیا اور امتحانات میں امتیازی پوزیشن حاصل کر لی۔

تقریباً ٹرائی پوس کے خاتمے کے دوران، ایلس نے منگنی پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میرے گھر والوں کی جانب سے اب تک مخالفت ختم نہ ہوئی تھی۔ ایلس کی جانب سے اس پیش رفت پر انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ مجھے 'راہِ راست' پر لانے کے لئے انہیں کوئی بڑا اقدام اٹھانا چاہیے۔ مجھے قابو میں رکھنا، ان کے اختیار میں نہ تھا۔ اور جو الزامات انہوں نے ایلس پر لگائے تھے، وہ فطری طور پر بے اثر ثابت ہو رہے تھے۔ پھر بھی انہوں نے ایک ایسا ہتھیار تلاش کر ہی لیا جو انہیں ان کے ارادوں کی تکمیل کے قریب تک لے گیا۔ ہمارے پرانے خاندانی ڈاکٹر نے تاریخ سے متعلق ایسی باتیں سنانا شروع کر دیں، جن سے متعلق ایک مبہم سا شبہ پہلے ہی میرے من میں تھا۔ وہ بتاتا کہ چچا ولیم کیسے پاگل پن میں مبتلا ہوئے، پھوپھی آگتھا کی منگنی کیسے اس کے جنونی وسوسوں کے باعث

ٹوٹی، نیز یہ کہ میرے والد کیسے مرگی کا شکار ہوئے (اس کے بعد البتہ ڈاکٹروں نے جو کچھ مجھے بتایا ،اس سے مرگی کی تشخیص درست ثابت نہیں ہوئی) اس زمانے سائنسی فکر رکھنے والے لوگ بھی خاندان میں نسل در نسل منتقل ہونے والی خصوصیات سے متعلق کسی قدر مافوق الفطرت رویہ رکھتے تھے۔ یوں بھی تب تک کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ناموزوں ماحول اور نامعقول اخلاقی تربیت سے ذہنی امراض کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ سو، ڈاکٹر کی باتوں سے میرے من میں یہ وسوسہ پیدا ہو گیا کہ میں بدقسمتی کے شکنجے میں ہوں۔ انہی دنوں میں نے البسن کی کتاب Ghosts اور جورنسن کی کتاب Heritage of the Kurts پڑھی۔ اُدھر میں نے دیکھا کہ ایلس کا ایک چچا بھی عجیب وغریب حرکتوں کا مالک ہے۔.......... میری پریشانی دوچند ہو گئی۔

میرے خاندان نے ان باتوں کو اور بھی نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ میں مسلسل یہ بکواس سنتے ہوئے خود کو پاگل محسوس کرنے لگا۔ میری حالت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ زور ڈالا کہ ہمیں شادی سے پہلے ماہر ڈاکٹروں سے مشورہ کر لینا چاہئے کہ ہمارے بچوں میں کہیں پاگل پن کے اثرات تو نہ ہوں گے۔ اور بہترین ماہرانہ رائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے خاندانی ڈاکٹر نے ہی دینی تھی۔ میرے گھر والوں کی جانب سے دباؤ ڈالنے پر اس نے یہ رائے دی کہ اگر میں ایلس سے شادی کر بھی لوں تو وراثت کے نقطہ نظر سے ہمیں بچوں کی خواہش سے دستبردار ہونا ہوگا۔ میں اور ایلس رچمنڈ میں ڈاکٹر کے گھر گئے تھے، جہاں اس نے ہمیں یہ فیصلہ سنایا۔ یہ سب سن کر ہم باہر نکلے اور رچمنڈ گرین پر ٹہلتے ہوئے اس پہ بحث کرتے رہے۔ بچوں کی مجھے شدید خواہش تھی اور ڈاکٹر کی بات بھی درست لگتی تھی، اس لئے میں منگنی توڑنے کو تیار تھا۔ جبکہ ایلس کا کہنا تھا کہ اسے بچوں کی زیادہ خواہش نہیں، لہٰذا وہ اس اجتناب کرنے اور شادی کرنے پر آمادہ تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ بحث کرنے کے بعد میں نے اس سے اتفاق کر لیا۔ یوں ہم نے اعلان کر دیا کہ ہم شادی کریں گے مگر بچے پیدا نہیں کریں گے۔ یہ واضح رہے کہ ان دنوں برتھ کنٹرول کو کوئی بہت ہی خوفناک قسم کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ سو، میرا خاندان اور فیملی ڈاکٹر پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اب ڈاکٹر صاحب یہ سمجھانے کی کوشش

کرتے رہے کہ ان کے وسیع طبی علم اور تجربے کے مطابق مانع حمل ادویات صحت کے لئے بے حد خطرناک ہوتی ہیں۔ گھر والوں نے یہ عندیہ بھی دیا کہ ایسی ہی دواؤں کے استعمال سے میرا باپ مرگی کا شکار ہوا تھا۔ تمام لوگوں نے مل کر رونے دھونے اور غمزدہ ہونے کا ایسا ماحول پیدا کرلیا کہ میرے لئے سانس لینا دشوار ہوگیا۔ میرے لئے یہ انکشاف دہشت ناک تھا کہ میرے والد مرگی کے مریض تھے۔ میری پھوپھی بھی دماغی خلل کا شکار تھیں اور میرا چچا بھی نیم پاگل تھا۔ یہ ایک دہشت زدہ کرنے والی بات تھی کیونکہ ان دنوں یہ تصور عام تھا کہ ذہنی امراض نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔ مجھے اس قسم کا ایک تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ 31 جولائی 1893ء کو (بعد میں پتہ چلا کہ یہ ایلس کی سالگرہ کا دن تھا) میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے میری والدہ فوت نہیں ہوئیں بلکہ محض ہوش وحواس سے محروم ہوئی ہیں۔ خواب کے دوران مجھ پر شدت سے یہ احساس طاری رہا کہ اس واقعہ کے باعث مجھے شادی سے گریز کرنا چاہئے۔

خدشات اور وسوسوں کی اس کیفیت کو واضح کرنے کے لئے یہاں میں 20 جولائی 1894ء کی رات کو لکھی گئی اپنی ایک تحریر سے ایک اقتباس درج کرتا ہوں۔ یہ تحریر میں نے سب سے چھپا کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ ایلس کو بھی بہت بعد میں دکھائی۔

20-21 جولائی، نصف شب

آج ایلس سے متعلق میرے خواب کو پورا ایک سال ہوگیا۔ اور آج ہی اس کا جنم دن بھی ہے۔ اس عجیب وغریب اتفاق نے، اس حقیقت کے ساتھ مل کر میرے تخیل پر گہرا اثر ڈالا ہے کہ میرے خواب اکثر سچے ثابت ہوتے ہیں۔ میں ویسے بھی سدا کا توہم پرست رہا ہوں، لیکن مسرت نے مجھے حد سے زیادہ توہم کا شکار بنا دیا ہے۔ کسی ایک فرد میں یوں ڈوب جانا، اس کو دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہنا خطرناک ہے۔ ایلس کے بنا میرے لئے کوئی چیز اہم نہیں رہی۔ حتیٰ کہ میرا کیریئر، میری ذہانت، خواہ وہ جیسی بھی ہے، ان سب کی میری نظر میں بس یہی اہمیت رہ گئی ہے کہ وہ ایلس کے کام آ

سکیں۔اس کیفیت کے باوجود میں خوش ہوں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بہت زیادی خوش ہوں۔اہم بات یہ ہے کہ میں اب بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ شکر ہے کہ میری محبت میں جنسی ہوس کا شائبہ بھی نہیں۔لیکن یہ کیا ہے کہ مسرت اپنی انتہا کو پہنچ کر کھودینے وسوسوں کی زد میں آجاتی ہے!

ایلس کی سالگرہ کے موقع پر میرا خواب،خواب میں یہ احساس کہ گھر والوں نے مجھے فریب دیا،ان کی مسلسل تنبیہ،میرے اہلِ خانہ کے ساتھ پیش آنے والے المیوں سے رفتہ رفتہ آگاہی،اور سب سے بڑھ کر پیم بروک لاج (رسل کا آبائی گھر) پر چھایا ہوا حزن وملال کا گہرا سایہ جو میری روح تک پہنچ چکا ہے،اور جو ایلس کی محبت پہ بھی اثر انداز ہونے لگا ہے۔......... یہ سب وسوسے،وراثت کے خوف کے ساتھ مل کر میرے ذہن کو کچوکے لگا رہے ہیں۔مجھے لگتا ہے کہ بدقسمتی میرے خاندان کا پیچھا کر رہی ہے،اور میں اس سے بھاگنے کی ناکام کوشش میں آزادی کی آرزو کر رہا ہوں،جو دوسروں کو بن مانگے مل جاتی ہے۔المیہ یہ ہے کہ اس خوف کا تعلق ایلس سے بھی ہے۔لگتا ہے کہ میں بدقسمتی کے پنجے سے نہیں نکل سکوں گا۔کاش کہ میں کسی کنارے تک پہنچ پاتا،لیکن بدقسمتی ایلس کو بھی میرے ساتھ اس دلدل میں گھسیٹنے پر مجبور کر رہی ہے۔خدا جانے مقدر کیا دن دکھلائے گا! میں کسی صدمے میں مبتلا ہو جاؤں گا یا کوئی مسلسل اذیت ہماری توانائیوں کو کھا جائے گی اور ہماری محبت کو بھسم کردے گی۔خاندانی آسیب کا خوف مجھ سے چمٹا ہوا ہے،وہ شاید مجھے اس خطا پہ بخشنے کو تیار نہیں کہ میں نے اس کی رنج والم کی روایت کو پامال کیا ہے۔

ہاں،یہ تمام احساسات احمقانہ ہیں۔یہ چاکلیٹ کیک کھانے اور رات کو دیر تک جاگنے سے پیدا ہوتے ہیں۔پھر بھی ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی اور ذرا سا موقع مل جائے تو وہ پوری قوت کے ساتھ مجھ پہ حملہ آور ہو جاتے ہیں۔گو کہ گھر والوں کو اس سے تکلیف ہوگی لیکن مجھے کچھ عرصہ کے لئے ہی سہی ،ان سے اور پیم بروک لاج سے دور رہنا ہوگا۔ورنہ میں جلد ہی اپنے ہوش وحواس کھودوں گا۔پیم برک لاج تو گویا میرے لئے خاندانی مقبرہ بن چکا ہے۔ڈاکٹر اینڈرسن کی باتوں سے لگتا ہے کہ پاگل پن کے آسیب نے گویا اس مقبرے کو مسکن بنا رکھا ہے۔شکر ہے کہ اس کے باوجود یہاں سب کچھ اور خصوصاً

میری ایلس، ٹھیک ہے۔ محبت کی خالص خوشی پانے کے لئے مجھے پیم بروک لاج اور اس کی دہشت ناک میراث سے خود کو دور رکھنا ہوگا۔ محبت کی خالص خوشی...... کتنی اعلیٰ اور لطف انگیز ہے"۔

اُس زمانے میں پیدا ہونے والے اس نوعیت کے خوف لاشعور طور پر ہمیشہ میرے ذہن پہ بوجھ بنے رہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس طرح کے خوف ناک خواب نہ دیکھے تھے۔ البتہ اس کے بعد میں اکثر ڈروائے خواب دیکھتا رہا۔ عام طور پر میں دیکھتا ہوں کہ کوئی پاگل مجھے قتل کر رہا ہے۔ تب میں زور زور سے چلانے لگتا ہوں۔ ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ جاگنے سے پہلے میں نے بیوی کا گلہ دبا دیا۔ اس بے چاری کی قسمت اچھی تھی کہ بچ گئی۔ گلہ دباتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں خود کو قاتلانہ حملے سے بچا رہا ہوں۔

اس قسم کے خوف کے باعث آئندہ کئی برسوں تک میں جذبات سے دامن بچاتا رہا۔ جہاں تک ممکن تھا جذبات کی بجائے غیر سنجیدہ وقفوں کی حامل ذہنی زندگی بسر کرتا رہا۔ خیر، خوش باش ازدواجی زندگی نے آہستہ آہستہ مجھے ذہنی استحکام بخش دیا۔ سو، بعدازاں جب کبھی اس طرح کے جذباتی مراحل آئے تو میں نے دیکھا کہ میں پاگل پن سے محفوظ رہ سکتا ہوں۔ یوں جنون کا شعور خوف تو دم توڑ گیا، لیکن لاشعوری خوف برقرار رہا۔

بہرکیف، شادی سے متعلق غیر یقینی اور خوف کی یہ فضا تب ختم ہوگئی، جب ایلس اور میں ایک اور ڈاکٹر سے ملے۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ خود کئی برسوں سے مانع حمل ادویات استعمال کرتا رہا ہے اور اس کے کوئی برے اثرات نہیں ہوئے۔ اس نے ہم سے یہ بھی کہا کہ شادی نہ کر کے ہم دونوں حماقت کریں گے۔ چنانچہ ہم نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ سچ یہ ہے کہ شادی کے دو سال بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جن ڈاکٹروں سے مشورہ لیتے رہے، وہ بکواس قسم کی باتیں ہی ہمیں بتاتے رہے۔ چنانچہ ہم نے بچے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایلس بانجھ نکلی۔ یوں اس بابت تمام تر ہنگامہ آرائی بے کار ہی رہی۔

یہ سارا غلغلہ تھمنے کے بعد میں فرائی ڈیز ہل کے مقام پر ایلس کے گھر والوں کے ساتھ رہنے لگا۔ انہی دنوں میں نے فیلو شپ کے مقالے پر کام شروع کیا اور غیر اقلیدسی ریاضی کو اپنا موضوع بنایا۔ میرے گھر والے روزانہ مجھے خط لکھتے، جن میں وہ میری زندگی پر تبصرہ کرتے۔ البتہ مجھے یہ یقین تھا کہ میں نے انہیں ذرا بھی موقع دیا تو یہ مجھے پاگل پن میں مبتلا کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ جبکہ دوسری طرف ایلس کی صحبت میرے لئے ذہنی سکون وصحت کا باعث بن رہی تھی۔ یوں ہم دونوں میں اُنسیت بڑھتی رہی۔

میرے گھر والوں نے لیکن ابھی مکمل طور پر ہار نہیں مانی تھی۔ اگست کے مہینے میں انہوں نے لارڈ فرین کو، مجھے اعزازی اتاشی کا عہدہ پیش کرنے پر آمادہ کرلیا۔ لارڈ صاحب ان دنوں پیرس میں ہمارے سفیر تھے۔ مجھے اس عہدے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ مگر دادی اماں کا کہنا تھا کہ ان کی زندگی اب کم رہ گئی ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہتی ہیں کہ کہیں دُور رہنے سے ایلس سے میری محبت کم تو نہیں ہو جاتی۔ ان کی وفات کی صورت میں خود کو ضمیر کی ملامت اور پچھتاوے سے بچانے کے لئے میں نے محض تین ماہ کے لئے پیرس جانے کا تہیہ کرلیا۔ طے یہ ہوا کہ اگر ان تین ماہ کے دوران میرے جذبہء محبت میں کوئی کمی نہ آئی تو گھر والے میری شادی کی مخالفت ترک کردیں گے۔ مختصراً یہ کہ سفارت کاری کا یہ تجربہ مختصر اور ناکام ثابت ہوا۔ مجھے صرف اس کام سے ہی نہیں بلکہ سفارت خانے کے ماحول اور دلوگوں سے بھی نفرت تھی۔ ایلس کی جدائی بھی تڑپا رہی تھی۔ وہاں میرا بھائی مجھ سے ملنے آیا۔ میں تب اس بات سے بالکل لاعلم تھا کہ گھر والوں نے اسے میری کیفیت جاننے اور جانچنے کے لئے بھیجا ہے۔ بہرحال میری کیفیت دیکھ کر وہ میرا حمایتی بن گیا۔ جونہی تین مہینے پورے ہوئے، میں فوراً پیرس کو الوداع کر کے ایلس کے پاس پہنچا۔ لیکن یہاں پہنچ کے پہلے اس کو منانا پڑا۔ دراصل وہ اپنی بہن کے خلاف رقابت میں جل رہی تھی۔ پیرس میں قیام کے آخری ایام میں اس کی بہن کے ساتھ میرا خاصا میل جول رہا، اور ایلس کو یہ بات بہت ناگوار گذری تھی۔ بہرحال، ایلس کو منانے میں مجھے بس دس منٹ ہی لگے۔

نیچے وہ خطوط درج ہیں، جو میں نے تین ماہ کی جدائی کے دوران ایلس کو لکھے تھے:

رامسبری مینور
ولٹ شائر
30 اگست 1894ء

میری پیاری!

پیرس میں (برطانوی سفارت خانے میں اعزازی اتاشی) عہدے کی پیشکش پر مجھے بھی بہت حیرت ہوئی ہے۔ اگر مجھے یقین ہو کہ یہ کام کرسمس کے بعد تک جاری نہ رہے گا اور اس کے بعد مجھے ایسے کسی عہدے پر کام نہ کرنا پڑے گا، تب میں یہ پیشکش قبول کرلوں۔ یوں ہجر کے دن سہولت سے کٹ جائیں گے۔ کیونکہ پیرس کے سفارت خانے میں مجھے واقعی خوش رہنا چاہئے۔ اس سے مجھے کچھ تو دنیا کا تجربہ حاصل ہوگا اور کچھ سفارت کاری کے داخلی معاملات کا علم ہوگا۔ یہ سب کچھ قابلِ قدر ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے ہماری ملاقات اور شادی لازماً ملتوی ہو جائے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ ایسا ہی ہوگا، اور یہ دلیل اس پیشکش کو قبول کرنے کے خلاف جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں دنیا اور اس کے انداز سے ڈرتا ہوں کہ وہ میرے لئے نقصاندہ ہی ثابت ہوتے ہیں، بالخصوص جب میں ان سے لطف اٹھا رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی خدشہ ہے کہ اس قسم کے کیریئر کو ایک بار قبول کر لینے کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا آسان نہ ہوگا۔ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اس عہدے کو قبول کرنے سے کئی اشرافی تعلقات بنیں گے جو ہماری آئندہ سرگرمیوں میں رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ تمہیں پتہ ہے کہ شادی کا پہلا سال

ہم نے سیر و سیاحت میں بسر کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے اور میں اسکول چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اس طرح نہ صرف ہم بہت سی تفریح کر سکیں گے بلکہ اس پروگرام کی بہت سی تعلیمی اہمیت بھی ہے۔ ہم دونوں بہت کچھ سیکھ سکیں گے۔ کاش دادی اماں نے زیادہ تفصیلات درج کی ہوتیں، جو کچھ ان کے خط سے واضح ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر میں نے یہ پیشکش قبول کر لی تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ اگر میں انکار کروں تو شاید لارڈ ڈفرین کو یہ بات ناگوار گزرے گی، گو کہ اس گریز ممکن ہے۔ میری بہت خواہش ہے کہ کاش اس موضوع پر مباحثہ کے لئے ہم مل بیٹھتے اور یہ کہ لوگان (رسل کا سالا) کی رائے بھی مجھے مل سکتی۔

دوپہر، دو بجے کے بعد.........

جتنا میں اس مسئلے پر سوچتا ہوں اتنا ہی مجھے لگتا ہے کہ اس پیشکش کو قبول کر لینے کا مطلب اس کیریئر میں پہلا قدم رکھا ہے، جس سے میں بچنا چاہتا ہوں۔ تاہم زیادہ وضاحت حاصل کئے بنا میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف اگر مین اکار کرتا ہوں تو یقیناً اس سے مجھے کوئی سیکریٹری شپ نہ مل سکے گی۔ کیونکہ لوگ اس قسم کے نک چڑھے اور بظاہر من موجی نوجوانوں کو منہ لگانا پسند نہ کریں گے۔ یہ بات فائدہ مند ہو سکتی ہے اور نقصاندہ بھی۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ کوئی اس کو کس زاویے سے دیکھتا ہے۔ میرا تو سر چکرا رہا ہے اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا۔

تمہارا

برٹی

پیم بروک لاج

رچمنڈ سرے

اتوار کی صبح

9 ستمبر 1894ء

سب سے پیاری ایلس!

یہ بات عجیب سہی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں فرائی ڈیز ہل (ایلس کی رہائش گاہ) پر گزارے ہوئے مہینے کی نسبت اب کئی اعتبار سے زیادہ خوش ہوں۔ لگتا ہے کہ میں اور تم مل کر دادی اماں کے لئے میری محبت کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور یہ کہ یہ کوشش ناکام ہی رہی۔ میرے ضمیر پہ بوجھ تھا۔ لہٰذا ہر رات میں دادی اماں کو خواب میں دیکھتا اور ہر بار بوجھ بڑھ جاتا۔ اب اگر وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرتی ہیں تو میرا ضمیر مطمئن ہوگا۔

تمہارا

برٹی

برطانوی سفارت خانہ

20 اکتوبر 1894ء

3 بجے، سہ پہر

میری پیاری ایلس!

میرے خیال میں ہماری جدائی کا حقیقی مصرف میرے ضمیر کو صاف کرنا اور ہماری شادی کو

قریب تر لانا ہے۔ تمہارے خیال میں میری یہ کیفیت زیادہ عرصہ قائم نہ رہے گی، لیکن میری رائے اس کے برعکس ہے۔ بشرطیکہ میں دادی اماں سے زیادہ میل جول نہ رکھوں۔ اب مجھے کسی فرض کا احساس نہیں ہوتا، البتہ جب دادی اماں اور پھوپھی آگتھا کے بارے میں سوچتا ہوں تو تھوڑی بہت جھنجلاہٹ ضرور ہوتی ہے اور اس جھنجلاہٹ کا باقی رہنا اچھا ہی ہے۔ ہماری جدائی قابلِ قدر ہے کیونکہ ہم دونوں اس علم کے بغیر حقیقی معنوں میں خوش نہ ہوتے کہ دادی اماں کے لئے ہم نے حقیقی معنوں میں کچھ نہ کچھ کیا ہے......

اس خط کے ساتھ میں تمہیں سانگر کے دو خطوط بھی بھیج رہا ہوں۔ میں نے ان کا جواب دیا ہے کہ میں غالباً دو مقالے تحریر کروں گا۔ ....دوسرا خط، پہلے سے زیادہ حوصلہ افزا ہے۔

میں مل کا مزید مطالعہ کرتا رہوں گا۔ کیمبرج کے سائنس کالج کے لئے میں نے 'ابتدائیات' پر مضمون لکھنا شروع کیا ہے۔ مختی سکاٹ میں ٹراٹر، اس کلب کا سیکریٹری ہے۔ ایک بار پھر کیمبرج جانا اور وہاں مقالہ پڑھنا، میرے لئے نہایت مسرت انگیز بات ہوگی۔

میری پیاری، میری خوشی، الوداع۔ کل میں پھر تمہیں خط لکھوں گا۔

تمہارا دل و روح

برٹی

میری اور ایلس کی شادی 13 دسمبر 1894ء کو ہوئی۔

ایک بوسے کی تمنا..........ہیلن

بالٹی مور میں ہم ایلس کے چچا اور کیرے کے والد ڈاکٹر تھامس کے ہاں مقیم رہے۔ ان کا خاندان خاصا دلچسپ تھا۔ ڈاکٹر کا ایک بیٹا جانز ہاپکنز یونیورسٹی میں دماغی سرجری کا ماہر تھا۔ بیٹی ہیلن بورن ماور میں رہائش پذیر تھی اور بدقسمتی سے سماعت سے محروم تھی۔ وہ نرم مزاج اور مہربان اور دل لبھا دینے والے سرخ بالوں کی مالک تھی۔ میں برسوں اس کا شائق رہا۔ یہ جذبہ 1900ء تک برقرار رہا۔ میں نے ایک، آدھ بار ہمت کر کے اس سے اپنا بوسہ لینے کی خواہش کی مگر اس نے ایسا کرنے سے انکار دیا۔

بعدازاں اس نے سمن فلیکسنر کے ساتھ بیاہ رچا لیا۔ وہ حفاظتی ادویات کے ادارے راک فیلر کا سربراہ تھا۔ اس کی شادی کے بعد بھی ہمارے دوستانہ مراسم برقرار رہے۔ البتہ اس کی زندگی کے آخری ایام میں، مجھے اس سے ملنے کے کم ہی مواقع ملے۔

ہچکچاہٹ کا تعلق............سیلی فیر چائلڈ

1899ء کی گرمیوں میں سیلی فیر چائلڈ سے میری آخری ملاقات ہوئی۔اس کے بعد 1940ء میں ہم ڈھلتی عمر میں ایک دوسرے سے ملے اور حیران ہوئے کہ ہم میں آخر کیا چیز ایک دوسرے میں دلچسپی کا باعث بنی تھی۔اس کا تعلق بستونیا کی اشرافیہ سے تھا۔اس کی خوش قسمتی مگر تب گہنا چکی تھی۔ہماری پہلی ملاقات 1896ء میں بوسٹن میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔خط وخال کے لحاظ سے وہ غضب ڈھاتی دوشیزہ نہ تھا،لیکن اس کے جیسی شاندار چال ڈھال والی عورت میں نے نہیں دیکھی تھی۔اس کے چاہنے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔اس سے میری دوسری ملاقات رش مور میں ہوئی۔جہاں وہ میرے چچا جنرل ہٹ ریورز کی دیہی حویلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

1899ء کی گرمیوں میں سیلی فرائی ڈیز بل میں کئی دنوں تک مقیم رہی۔تب میں اس کو بہت چاہنے لگا۔میں اس جذبے کو محبت تو نہیں کہوں گا،کہ میں نے اس دوران اس کا ہاتھ تک چومنے کی کوشش نہیں کی تھی۔البتہ بعدازاں میں نے محسوس کیا کہ اس نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔گرم شام کے دھندلکوں میں اس کے ساتھ ایک عرصے تک ہونے والی معمول کی سیر مجھے آج بھی یاد ہے۔اس زمانے کی فرسودہ اور کڑی رسوم کے تحت تب ہم دل کی بات زباں پر لانے سے ہچکچاتے رہے۔

عشقِ جنوں خیز..........اوٹولن

"اصولِ ریاضی" کو مکمل کرتے ہوئے میں گومگوں کیفیت کا شکار تھا۔ایک طرف جہاں اس تھکا دینے والے کام کے پایہ تکمیل کو پہنچنے کی خوشی تھی تو دوسری طرف کسی قید خانے سے چھوٹنے جیسا احساس ہو رہا تھا۔انہی دنوں میں نے بجٹ اور پارلیمنٹ ایکٹ کے معاملے پر لبرلز اور لارڈز کے مابین ہونے والی کشمکش میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔یہیں سے مجھے خارزارِ سیاست میں پیر رکھنے کا شوق ہوا۔میں نے حلقہ انتخاب کے لئے لبرل ہیڈ کوارٹرز کو درخواست دے دی۔میرے لئے بیڈفورڈ کا حلقہ تجویز کیا گیا۔میں نے وہاں لبرل ایسوسی ایشن سے خطاب کیا، جسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔البتہ خطاب سے پہلے مجھے امیدواروں سے کئے جانے والے باضابطہ سوالات کے ایک سلسلے سے گذرنا پڑا۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے،اس کی مختصر روداد کچھ یوں تھی؛

سوال: کیا آپ چرچ آف انگلینڈ کے رکن ہیں؟

جواب: نہیں میری پرورش ایک تقلید نہ کرنے والے کے طور پر ہوئی ہے۔

سوال: کیا آپ اب بھی اسی طرح سوچتے ہیں؟

جواب: نہیں، اب ایسا نہیں ہے۔

سوال: کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ آپ دہریے ہیں؟

جواب: یقیناً آپ کو یہی مطلب لینا چاہئے۔

سوال: کیا آپ کبھی کبھار چرچ جانا پسند کریں گے؟

جواب: جی نہیں۔

سوال: کیا آپ کی بیگم کبھی کبھار چرچ جانا پسند کریں گی؟

جواب: جی نہیں، وہ بھی ایسا کرنا پسند نہیں کریں گی۔

سوال: کیا ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ آپ دہریے ہیں؟

جواب: جی ہاں، شاید اس کا یہی مطلب ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے میری بجائے مسٹر کیلاوے کو اپنا امیدوار منتخب کر لیا۔ بعد ازاں وہ پوسٹ ماسٹر جنرل بنے اور جنگ کے زمانے میں ان کی آرا درست رہیں۔ ان صاحبان نے اس انتخاب پر یقیناً سکھ کا سانس لیا ہوگا۔

بہر حال، میں خود اپنے تئیں خوش قسمت تصور کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن دنوں بیڈفورڈ کا قضیہ چل رہا تھا، اسی دوران ٹیرنٹی کالج کی جانب سے مجھے ریاضی کا لیکچرر بننے کی پیشکش ہوئی۔ یہ پیشکش میرے لئے سیاست سے کہیں زیادہ پرکشش تھیں۔ گو کہ بیڈفورڈ کے لئے میں قابلِ قبول ہوتا تو کیمبرج کو شاید رد کر دیتا، مگر ایسا نہ ہوا، اس لئے میں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ 1910ء کے اکتوبر کے دورانیے میں میں نے کام کا آغاز کر دیا۔ رہائش کے لئے ہمیں برج سٹریٹ میں جگہ ملی۔ میرے اور ایلس کے کمرے نیوائلز کورٹ میں تھے۔ مجھے ان کمروں سے جلد ہی ایک اُنس سا ہو گیا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ 1894ء میں کیمبرج چھوڑنے سے کے بعد سے پہلی بار مجھے ایسی جگہ نصیب ہوئی تھی جو صرف میرے لئے تھی۔ ہم نے باگلے ووڈ والا اپنا مکان فرخت کر دیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب زندگی ایک معمول میں آنے کو ہے.......... مگر یہ توقع عبث رہی۔

جنوری 1910ء میں انتخابات ہوئے۔ میں اس دوران باگلے ووڈ میں ہی مقیم تھا۔ میں طے کیا کہ مجھے ان انتخابات میں حتیٰ الوسعٰی لبرلز کی حمایت کرنی چاہئے۔ البتہ میں اپنے حلقے کے رکن سے حتیٰ الامکان دور رہنا چاہتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے کئی اہم وعدوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس لئے میں ایک اور امیدوار کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ یہ دریا کے اس پار رہتا تھا۔ اس کا نام فلپ موریل تھا۔ وہ آکسفورڈ میں میرے سالے لوگان کا ہم نشیں رہ چکا تھا۔ لوگان اکثر اس کی تفریقیں کرتا

تھا۔فلپ موریل نے ڈیوک آف پورٹ لینڈ کی بہن لیڈی اوٹولن کیونڈش بینٹنی تک سے بیاہ کیا تھا۔میں اس خاتون کو بچپن کے زمانے سے جانتا تھا۔یہ معمولی سی جان پہچان تھی۔اس واقفیت کا سبب اس کی ایک خالہ مسز اسکاٹ تھیں۔وہ ہیم کومن میں مقیم تھیں۔یہ خاتون ملکہ الزبتھ کی دادی تھیں۔مسز اسکاٹ کے گھرانے سے متعلق مجھے دو باتیں یاد ہیں؛ان میں اوٹولن کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔پہلی یاد کا تعلق اس گھر میں ہونے والی بچوں کی ایک تقریب سے ہے،جہاں میں نے پہلی بار آئس کریم کا ذائقہ چکھا۔میں نے آئس کریم کو عام قسم کی پڈنگ سمجھتے ہوئے اس کا ایک بڑا سا نوالہ منہ میں لے لیا۔یہ اس قدر ٹھنڈا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہاں موجود لوگ حیران و پریشان ہو گئے کہ بچے کو خدا جانے کیا ہوا۔دوسری یاد اس سے زیادہ ناخوشگوار ہے۔ہوا یہ کہ مسز اسکاٹ کے گھر میں کیرج سے اترتے ہوئے ،میں نیچے گر گیا۔اس سے میرے عضوئے تناسل کو خاصی چوٹ پہنچی۔اس کے بعد کافی دنوں تک مجھے روزانہ دو بار گرم پانی کے ٹب میں بیٹھ کر اپنے عضوئے تناسل کو اسفنج سے صاف کرنا پڑتا تھا۔اس وقت تک کیونکہ مجھے اپنے عضو کو نظر انداز کرنے کی تربیت دی گئی تھی، اس لئے روز اس پر توجہ دینا اور اسے صاف کرنا میرے لئے کوفت کا باعث تھا۔

اوٹولن سے فلپ کی منگنی ہوئی تو لوگان حسد سے جلنے لگا تھا۔وہ اکثر اوٹولن کا مذاق اڑاتا۔بعدازاں اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔میری فلپ اور اوٹولن سے کبھی کبھار ملاقات ہوجاتی تھی۔فلپ سے متعلق میری رائے کبھی بھی اچھی نہ رہی تھی۔جبکہ اوٹولن بہت زیادہ میک اپ اور خوشبوئیں استعمال کرنے کی شوقین تھی۔اس سے میرے پیورٹن جذبات مجروح ہوتے تھے۔بعدازاں کرومپٹن ڈیویز کے باعث مجھے اوٹولن کے بارے میں اپنی رائے بدلنی پڑی۔وہ کرومپٹن ڈیویز کی لینڈ ویلیوز آرگنائزیشن کے لئے کام کیا کرتی تھی اور میں اس سے شدید متاثر تھا۔

جنوری 1910ء کے انتخابات کے دوران میں نے کئی راتیں فلپ موریل کی حمایت میں تقریریں کرتے ،اور اکثر دن اس کے لئے مہم چلاتے گزارے۔میرے ساتھ اس دوران پیش آنے والا واقعہ مجھے اب بھی یاد ہے۔میں مہم کے سلسلے میں اس کے پاس گیا تو اس نے شدید غصے سے

کانپتے ہوئے کہا، ”تمہارا خیال ہے میں اس بدمعاش کو ووٹ دوں گا؟ دفع ہو جاؤ میرے گھر سے، ورنہ میں تم پر کتے چھوڑ دوں گا۔“ انتخابی مہم کے دوران آکسفورڈ اور کنسورشیم کے مابین واقع تقریباً ہر گاؤں میں، میں نے اجتماعات سے خطاب کیا۔ اس طرح اس مہم کے دوران مجھے اوٹولن کو جاننے کے کئی مواقع ملے۔ مین نے دیکھا کہ وہ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ غیر معمولی مہربانی سے پیش آتی ہے، اور سماجی معاملات میں نہایت سنجیدہ رویے کی حامل ہے۔ خیر انتخابات میں اردگرد کے دیگر لبرلز کی طرح فلپ بھی ہار گیا۔ بعدازاں اسے برنلے کا حلقہ انتخاب ملا، جہاں وہ دسمبر 1910ء سے لے کر 'قیصر مردہ باد' والے الیکشن تک رکن رہا۔

بعدازاں ایک عرصے تک میں موریل جوڑے سے نہ مل سکا۔ مارچ 1911ء میں مجھے پیرس میں تین لیکچر دینے کی دعوت ملی۔ ان میں سے ایک لیکچر سوربون میں دیا جانا تھا اور باقی دو دیگر مقامات پر۔ پیرس جاتے ہوئے میں نے ایک رات لندن میں رکنے کا فیصلہ کیا۔ سو میں نے فلپ اور اوٹولن سے درخواست کی کہ وہ مجھے ایک رات کے لئے اپنی رہائش گاہ 44، بیڈ بورڈ اسکوائر میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ اوٹولن اچھے ذوق کی مالکہ تھی اور اس کا گھر شاندار تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو خوبصورت چیزیں مجھے ہمیشہ پسند رہی ہیں۔ گو کہ وہ میری دسترس میں کبھی نہیں رہی ہیں۔

اوٹولن کے گھر کے ماحول نے میرے اندر کوئی ایسی چیز پیدا کر دی، جس سے میں پہلی شادی کے تمام برسوں میں محروم رہا تھا۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی لگا جیسے بیرونی دنیا کی ساری مصیبتیں باہر رہ گئی ہیں۔ میں 19 مارچ کو وہاں پہنچا۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ فلپ کو اچانک برنلے جانا پڑ گیا تھا۔ یوں گھر میں اوٹولن اور میں تنہا تھے۔

ڈنر کے دوران ہم دونوں برنلے سیاست اور حکومتی ناکامیوں پہ گفتگو کرتے رہے۔ بعدازاں گفتگو نجی ہوتی گئی۔ میں نے جھجکتے ہوئے پیش رفت کی کوشش کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اوٹولن بھی گویا اس کی منتظر تھی۔ اس سے پہلے میں نے یہ سوچا تک نہ تھا کہ وہ ایک ایسی عورت ہو

سکتی ہے جو اتنی آسانی سے مجھے پیار کرنے کا موقع فراہم کرے گی۔ شام کے سائے ڈھلتے ہی، اسے ہاتھوں میں لینے کی خواہش بے قرار ہو رہی تھی۔ بالآخر میں بے قابو ہو گیا، اور گویا ایک دم مجھ پہ یہ منکشف ہوا کہ میں اس کی جانب شدید جھکاؤ رکھتا ہوں، اور اس کے جذبات بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

تب تک ایلس کے علاوہ کسی عورت سے میرے جسمانی تعلقات استوار نہیں ہوئے تھے۔ اس شام کسی وجہ میں اوٹولن کے ساتھ جنسی عمل کی پیش رفت سے قاصر رہا۔ گو کہ ہم نے باہمی رضامندی سے یہ طے کر لیا کہ جلد ہی ہم دونوں جنسی تعلق قائم کر لیں گے۔ میں بالخصوص بے قابو ہوا جا رہا تھا، اور میں نے اس سلسلے میں ہر رکاوٹ دور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ایلس سے الگ ہونا چاہتا تھا اور میری خواہش تھی کہ اوٹولن بھی فلپ سے علیحدہ ہو جائے۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ اگر فلپ کو پتہ چل گیا تو وہ کیا سوچے گا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ وہ ہم دونوں کو قتل کر دے گا (یہ بات بعدازاں مجھے مسز وائٹ ہیڈ نے بتائی تھی) تو بھی میں اوٹولن کے ساتھ بتائی گئی ایک رات کے لئے یہ قیمت ادا کرنے کو تیار تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ (ایلس کے ساتھ) نو سالہ نفس کشی کے دن اب ختم ہونے کو ہیں۔ خیر وہ ایک شام مستقبل کے تمام منصوبے تشکیل دینے کو نا کافی تھی۔ ہم نے جب بوس و کنار کا آغاز کیا تو پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ صبح چار بجے تک ہم ساتھ رہے، اس دوران بوس و کنار کے وقفوں میں ہی باتیں ہوتی رہیں۔ صبح سویرے ہی میں نے پیرس کے لئے روانہ ہونا تھا۔ جہاں مجھے خاصے نازک مزاج حاضرین کے سامنے فرانسیسی میں لیکچر دینا تھا۔ میرا ذہن اب منتشر ہو چکا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ اردگرد کی تمام چیزیں بے مصرف دکھائی دیتی تھیں۔ اسی دوران اوٹولن سٹڈلینڈ جانے والی تھی۔ جو اس زمانے میں ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ طے یہ پایا کہ میں وہاں تین دن اس کے ساتھ گزاروں گا۔

سو، پیرس میں میرا لیکچر اچھا نہ ہوا۔ میں نے واپسی پہ اپنا ویک اینڈ فرن برسٹ میں ایلس کے ساتھ گزارا۔ وہاں پہلے میں دانتوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس نے بتایا کہ اسے خدشہ ہے

کہ شاید مجھے کینسر ہے۔اس نے مجھے ایک ماہر معالج سے ملنے کو کہا، جس سے تین ہفتوں تک میری ملاقات نہ ہو سکی۔ دراصل وہ ایسٹر کی چھٹیوں پر گیا ہوا تھا۔ وہیں میں نے ایلس سے اوٹولن کا ذکر چھیڑا۔ وہ طیش میں آ گئی۔ اس نے دھمکی دی کہ وہ اوٹولن کا نام بیچ میں لا کر طلاق لینے پر اصرار کرے گی۔ دوسری طرف اوٹولن اپنے بچے اور فلپ سے قلبی لگاؤ کے باعث طلاق نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے میں طلاق کے معاملے میں اس کا نام نہیں لانا چاہتا تھا۔ میں نے ایلس سے کہہ دیا کہ وہ اپنی مرضی سے طلاق لے سکتی ہے لیکن اس میں اوٹولن کا نام ہرگز نہیں آنا چاہئے۔ مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ اس لئے میں نے بھی اسے خبردار کر دیا کہ اگر اس نے ایسا کوئی اقدام اٹھایا تو میں اوٹولن کو شرمندگی سے بچانے کے لئے خودکشی کرلوں گا۔ میں نے واقعی ایسا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور ایلس کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لئے وہ غصے سے بے قابو ہو گئی۔ کچھ گھنٹے وہ نہایت غصے کے عالم میں وہ اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ میں نے اس دوران اس کی بھتیجی کو لاک کے فلسفے پر ایک سبق پڑھایا۔ وہ ٹرائی پوس کا امتحان دے رہی تھی۔ اس سے فارغ ہو کر میں بائیسکل لے کر نکل گیا۔ یوں میری پہلی شادی انجام کو پہنچی۔ اس واقعہ کے تقریباً چالیس برس کے طویل عرصے کے بعد تک میرا ایلس سے کوئی سامنا نہ ہوا۔ 1950ء میں ہم اجنبی آشناؤں کی طرح سرسری ایک دوسرے سے ملے۔ 21 جنوری 1951ء کو ایلس کا انتقال ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد میں نے سیدھا سٹڈ لینڈ روانہ ہوا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ دندان ساز کے مشورے کے مطابق ماہر ڈاکٹر سے میری ملاقات نہ ہو پائی تھی، اس لئے میں اس یقین کے ساتھ سٹڈ لینڈ پہنچا کہ کینسر کا موذی مرض میری جان لینے والا ہے۔ سوانج کے مقام پر میں نے ایک پرانے طرز کی گھوڑا گاڑی حاصل کی، جس کا گھوڑا انتہائی سست رفتار تھا۔ وہ جس کاہلی سے پہاڑی پر چل رہا تھا، اس سے میرا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے اوٹولن تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ بالآخر میں نے اوٹولن کو لب سڑک پائین ؤڈ میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ میں گھوڑا گاڑی سے اترا اور فوراً اس تک پہنچا۔

سٹڈ لینڈ میں گزارے ہوئے تین دن اور تین راتیں، میری یادوں کے تنہاں خانوں میں

آج بھی محفوظ ہیں۔ یہ زندگی سے بھرپور لمحے تھے۔ کاش زندگی ہمیشہ یونہی بھرپور رہتی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر اوڈولن کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں کینسر میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ مجھے لگتا تھا کہ خوشی اور مسرت کے یہ چند لمحے میں نے موت کے پنجے سے چھینے ہیں۔ دندان ساز نے جب کینسر کے خدشے کا اظہار کیا تو میں نے خدا کو مبارکباد دی کہ اس نے مجھے اس وقت قابو کر لیا جب کہ میں دامن میں خوشیاں سمیٹنے والا تھا۔ شاید میرے اندر کہیں ایسے خدا پر ایمان موجود ہے جو دوسروں کو تکلیف دے کر مسرور ہوتا ہے۔ تاہم سٹڈ لینڈ میں گزارے ہوئے تین دنوں کے دوران مجھے محسوس ہوتا رہا کہ یہ کینہ پرور دیوتا اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ بعد ازاں اسپیشلسٹ سے ملنے کے بعد پتہ چلا کہ کینسر کا خدشہ، خیالی تھا۔

اوڈولن دراز قامت تھی۔ اس کا چہرا لمبوترا اور پتلا تھا۔ اس کے گیسو نہایت حسین اور غیر معمولی رنگت کے حامل تھے؛ سنگترے سی رنگت جیسے۔ عام طور پر لوگ سمجھتے تھے کہ اس نے بالوں میں رنگ کیا ہوا ہے۔ مگر ایسا نہ تھا۔ اس کے بالوں کی رنگت ہی ایسی تھی۔ اس کی آواز، دلنشیں اور نرم و نازک تھی۔ وہ ایک مضبوط ارادے کی حوصلہ مند خاتون تھی۔ شروع میں ہم جھجک کر شکار ہوئے، لیکن رفتہ رفتہ سب پردے ہٹ گئے۔ جھجک اور حیا کے جذبے ختم ہو گئے اور ہماری قربت میں مسرت کا جذبہ بڑھنے لگا۔ ہم دونوں خلوصِ دل سے پُر جوش اور باغی تھے۔ روایت کے ضمن میں ہم دونوں اَرسٹوکریٹ تھے۔ مگر موجودہ ماحول میں ہم نے یہ نقاب اتار دیا تھا۔ ہم دونوں ظلم و جبر، طبقاتی فخر اور اشرافیہ کی تنگ نظری سے نالاں تھے۔ اس کے باوجود ہم اپنے اس منتخب ماحول میں کس قدر اجنبی تھے۔ ہم عام لوگوں کے لئے برسر پیکار تھے، ان کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم تھے، لیکن ہمارے طبقاتی پس منظر کے باعث وہ لوگ ہمیں شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہم دونوں اس صورتحال سے پیدا ہونے والے افسردہ احساسات کا شکار تھے۔ اسی مشترکہ احساس کے باعث ہمارے بیچ ایسی گہری ہمدردی پیدا ہو گئی جو اوڈولن کی موت تک برقرار رہی۔ گو کہ 1922ء کے بعد ہم ایک دوسرے کے چاہنے والے نہ رہے مگر ہمارے بیچ گہری دوستی کا تعلق ہمیشہ برقرار رہا۔

اوٹولن نے مجھ پر شدید اثرات مرتب کئے اور وہ سب کے سب مثبت رہے۔ جب کبھی میرا رویہ کسی استادانہ یا خود پسندانہ ہوتا، یا میرا انداز آمرانہ ہو جاتا تو وہ مجھ پر ہنس دیتی۔ اس نے مجھے آہستہ آہستہ اس وہم سے بھی نجات دلا دی کہ مجھ میں کوئی ایسی مکاری یا بدکاری ہے جس پر قابو پانے کے لئے فولادی ضبطِ نفس کی ضرورت ہے۔ اس نے میری خودغرضی کم کر دی۔ اسی کی صحبت میں میرا راست گوئی کا دعویٰ بھی کمزور پڑ گیا۔ وہ زبردست حسِ مزاح کی مالک تھی اور میں بلا ارادہ اس کی حسِ مزاح کی قوت کو بھڑکانے کے خطرے سے بھی آگاہ ہو گیا تھا۔ اس نے میری شخصیت میں دادی کی طرف سے ملنے والے پیورٹن اثرات بھی کم کر دیے اور اب میں دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے باز رہنے لگا۔ بلاشبہ محرومیوں کے ایک طویل عرصے بعد نصیب ہونے والی اس کی مسرت انگیز محبت نے میرے لئے تمام معاملات سہل کر دیے تھے۔ اکثر مرد، خواتین سے اثر لینے سے کتراتے ہیں۔ میرے تجربے کے مطابق یہ احمقانہ بات ہو گی۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ ذہنی وجسمانی ہر دو اعتبار سے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی محبوب عورتوں سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی صحبت کے بنا میں کہیں زیادہ متعصب اور تنگ نظر ہوتا۔

سٹڈ لینڈ کے بعد بہت سے معاملات مسائل کا باعث بننے لگے۔ ایلس کا جوش ابھی تھما نہیں تھا اور (اس کا بھائی) لوگان بھی غصے میں تھا۔ وائٹ ہیڈ جوڑے نے تب بڑی مہربانی کی۔ انہوں نے ان دونوں کو سمجھایا کہ وہ طلاق کا معاملہ اوٹولن کو بیچ میں لائے بغیر حل کرنے کی کوشش کریں۔ ایلس کا خیال تھا کہ اس طرح طلاق کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ ادھر میں چاہتا تھا کہ اوٹولن اپنے شوہر فلپ سے علیحدہ ہو جائے۔ مگر مجھے جلد ہی اس خواہش کے پورے نہ ہونے کا احساس ہو گیا۔ دوسری طرف میرا سالا لوگان، فلپ کے پاس چلا گیا اور اپنی کئی شرائط اسے بتا دیں۔ فلپ نے وہی شرائط اوٹولن پر عائد کر دیں۔ یہ نہایت سخت شرائط تھیں اور ہماری محبت کی مسرت میں رکاوٹ پیدا کرتی تھیں۔ ان میں سب سے کڑی شرط یہ تھی کہ میں اور اوٹولن کہیں اکٹھے

رات نہیں گزار سکتے۔ میں ان سب پہ جل بھن رہا تھا۔ اوٹولن اسے مضبوط قوتِ ارادی کے ساتھ جھیل رہی تھی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے ایسا ماحوم بن گیا کہ جس میں پہلے جیسی مسرت کا حصول مشکل ہو گیا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اوٹولن کے لئے اس کا شوہر، اس کا بچہ اور اس کی جائیداد بہت معنی رکھتی تھی۔ جبکہ میرے لئے اُس سے اہم کچھ بھی نہ تھا۔ اس نابرابری نے مجھے سخت گیر اور حاسد بنا دیا۔

شروع میں تو محبت کی مسرت ان تمام رکاوٹوں پر حاوی رہی۔ چلٹرمنز میں پیپرڈ کے مقام پر اوٹولن کی ایک مختصر رہائش گاہ تھی۔ جولائی کے مہینے میں وہ وہیں رہی۔ میں وہاں سے چھ میل کے فاصلے پر ایسڈن میں رہائش پذیر تھا۔ میں روزانہ سائیکل پر سوار ہو کر اس سے ملنے جاتا۔ دوپہر کے قریب میں وہاں پہنچتا اور رات گئے تک وہیں رہتا۔ وہ شدید گرمیوں کے دن تھے۔ ہم دونوں دوپہر کا کھانا باہر کھاتے اور سہ پہر کی چائے تک واپس گھر آ جاتے۔ یہ بڑے مسرت بھرے ایام تھے۔

اوٹولن کی طبیعت ان دنوں ناساز تھی۔ جس کے باعث اسے میرین بیڈ جانا پڑا۔ چند روز بعد میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ وہاں میرا قیام ایک ہوٹل میں رہا۔ خزاں کے موسم تک وہ لندن لوٹ گئی۔ میں بھی واپس آیا اور میوزیم کے قریب بری سٹریٹ میں ایک فلیٹ لے لیا، تاکہ ہم وہاں با آسانی مل سکیں۔ ان دنوں میں کیمبرج میں لیکچر دے رہا تھا۔ میں صبح کے وقت جاتا اور لیکچر کے بعد واپس آ جاتا۔ اوٹولن ان دنوں شدید سر درد میں مبتلا تھی۔ اس لئے ہماری اکثر ملاقاتیں بے کیف رہنے لگیں۔ ایسے موقع پر میں بے مروت بن جاتا، جو اچھا رویہ نہ تھا۔ اس کے باوجود سوائے ایک شدید اختلاف کے، سردیوں کا موسم اچھا گذرا۔ اس اختلاف کا معاملہ یہ تھا کہ میں اوٹولن کے مذہبی رویے سے شدید خائف رہتا، اور اس پر نکتہ چینی بھی کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے اس احساس نے مزید چڑچڑا کر دیا کہ جتنا مجھے اس کا خیال ہے، وہ اتنی ہی مجھ سے بے پرواہ ہے۔ گو کہ ہر وقت ایسا نہ تھا۔ جیسے کہ میں انجانے میں 'پائیوریا' کے مرض میں مبتلا ہو گیا، جس سے میری سانس بدبودار ہو گئی تھی۔ مجھے اس کا پتہ

نہ تھا۔اوٹولن نے مجھ سے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا۔خود اس مرض کا علم ہونے پر جب میں نے اس کا علاج کروالیا تب کہیں جا کر اُس نے اِس کا ذکر کیا،اور بتایا کہ میری ناگوار سانسوں کو جھیلنا اس کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوتا تھا۔

ذیل میں وہ خطوط درج ہیں، جو 1911ء کے اوائل میں،اوٹولن سے معاشقے کے ابتدائی عرصے میں اس کے نام لکھے گئے۔

ٹرین میں

21مارچ1911ء

پیاری اوٹولن!

میرا دل (محبت کے جذبات سے) یوں چھلک رہا ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آرہا کہاں سے شروع کروں۔مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ اڑتالیس گھنٹوں میں دنیا میرے لئے کتنی بدل چکی ہے۔تم مجھ پہ مکمل طور پہ چھا چکی ہو۔تقریب میں لوگ کیا کہتے رہے،میں نے سنا ہی سنا۔کل شام باب ٹیری مسلسل بولتا رہا،لیکن میں صرف مدہوشی کے کچھ لمحوں سے نکل کر سوچتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔اچھا یہ ہوا کہ میں اسے ہاں،ہوں میں جواب دیتا رہا۔میری نظریں تو بس تمہی پہ ٹکی رہیں،حالانکہ میں کسی کی جانب مسلسل زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکتا۔میں تمہارے سحر میں گرفتار ہو چکا ہوں،اور مجھے یقین ہے کہ جتنا میں مزید دیکھوں گا،یہ جذبہ اور شدید تر ہوتا جائے گا۔میں تمہارے ساتھ کئی حسین نظاروں کی سیر کرنا چاہتا ہوں،تا کہ تمہارا اپنا حسن،اور وہ حسن جو تم تخلیق کرتی ہو،وہ فطرت کے نظاروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

تم سے واقفیت سے قبل ہی یہ خواہش مجھ میں پنپنا شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ میں نے تمہیں فلپ کی شخصیت کی تعمیر کرتے دیکھا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن جب تمہارے ساتھ میں نے لبِ ساحل چہل قدمی کی تھی، تبھی مجھ میں یہ جذبہ بیدار ہوگیا تھا۔ تب سے اب تک میں نے اس حوالے سے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا۔ صرف مدہم جبلت ہی اس جذبے کی بیداری سے واقف تھی۔ میرا شعوری علم دھند میں تھا۔ کاش ایسا نہ ہوتا، لیکن مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ میں اس سب کا ایک عرصے سے متلاشی تھا۔ اس کے باوجود تمہاری محبت میرے لئے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوگی۔ میں خود کو نہایت بے رحم اور بے وقعت محسوس کرتا ہوں اور زندگی کی جمالیاتی اقدار سے بے بہرہ پاتا ہوں؛ ایک منطقی مشین کی طرح، جو ہر اُس خیال کو تلف کر دینا چاہتی ہے جو اس کے معیار سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ میں خود ہی اپنے تصورات کا نقاد ہوں۔ کیونکہ لوگوں کی اکثریت ایسا نہیں کرتی، اس لئے اکثر لوگ مجھے قنوطیت پسند سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے، میں دل کی گہرائی سے سب سے پیار کرتا ہوں۔ ہاں، کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ میں کچھ اور بے رحم ہوتا تو زندگی کس قدر سہل ہو جاتی! Same condition me

میں اب بھی تم سے زیادہ واقف نہیں۔ مگر امید کرتا ہوں کہ خود کو جاننے میں تم میری مدد ضرور کروگی۔

پیرس میں، میں خود کو مجتمع کرنے کی کوشش کروں گا۔ جب فلسفی مجھ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہے ہوں گے تو ممکن ہے کہ شاید میری توجہ تقسیم ہو جائے اور میں تمہیں نہ سوچ سکوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ پہلے کی نسبت اب یہ سب مجھے معمولی محسوس ہوگا۔

الوداع جانِ من! میں اس لمحے کا بے تابی سے منتظر رہوں گا جب دوبارہ تمہارا ساتھ نصیب ہوگا۔

اپنے تمام تر پیار کے ساتھ

'بی'

17۔ کارلائل اسکوائر

29 مارچ، 1911ء

اے دلربا!

تمہارا یہ خیال درست ہے کہ ہمیں اپنی دلی تمناؤں کے علاوہ ہر چیز سے بے پرواہ ہو جانا چاہئے۔ تم سے ایک بار پھر ملنا، میرے لئے باعثِ مسرت ہوگا۔ کل صبح یہاں ناشتے کے بعد جس وقت تم آسکو، مجھے خوشی ہوگی۔

میرے دل میں نہ تو کوئی نفرت یا تلخی ہے نہ ہی کوئی بغاوت۔ جو ہوا، یہی ہونا چاہئے تھا۔ اب جو ہے، وہی سب سے اچھا اور بہتر ہے۔ تمہارا پیار مجھے جلا بخشتا ہے۔ میں اپنی صورتِ حال پہ نہایت مسرور ہوں۔ حالانکہ مجھے اس پر حیرت بھی ہے کہ ایک انجانا سے درد محسوس کرنے کے باوجود جتنا خوش میں اس وقت ہوں، زندگی میں کبھی اتنا خوش نہیں رہا۔ تم ہرگز یہ مت سوچنا کہ مجھے تمہارے پیار کی سچائی پر شک ہے۔ میرے لئے کچھ چیزیں ایسی ہیں، جنہیں مجھے پیار پر فوقیت دینا پڑتی ہے۔ اگر اس پیار کی وقعت ہی جاننا ہے تو سنو، تم میرے دل میں مذہبی بنیادوں کی طرح مقیم ہو۔ جو دنیا کو درد کوکوف کے باوجود سہانا بناتی ہیں۔

پیاری محبوبہ، تم جیسی ہو میں تمہیں اسی طرح قبول کرتا ہوں۔ اپنے پیار اور حوصلے کے لئے تم داد کی حقدار ہو۔ تم نے مجھ پر یہ دنیا روشن کر دی ہے، جسے اب کوئی چیز ختم نہیں کر سکتی۔

الوداع، الوداع، الوداع............

'بی'

17۔کارلائل اسکوائر

30مارچ،1911ء

جانِ جہاں!

میری روح پر مسرت طاری ہے۔گردوپیش کی ہر چیز میں، میں تمہارا عکس پاتا ہوں۔میں اب بھی خود کو تمہارے بانہوں کے گھیرے میں پاتا ہوں،اوراپنے ہونٹوں پہ تمہارے بوسے کالمس محسوس کرتا ہوں۔تم میرے جیون میں کسی مقدس صحیفے کی مانند در آئی ہو۔میں نے تمہیں یوں نرمی سے چھوا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔یہ تقدس ہمیشہ برقرار رہے گا۔میں تمہیں وہ محبت دینے کی کوشش کروں گا جس کی تم بجا طور پر حقدار ہو۔تم نے میرے اندر کی ان تاروں کو چھیڑ دیا ہے جو دنیا کے خوبصورت نغمے گنگناتی ہیں۔غم خوردہ سالوں میں میرے اندر پلتی رہی شاعری،اب پھر سے کروٹیں لینے لگی ہے۔

تم نے مجھے جس قدر پیار سے نوازا ہے،میں اس کے قابل نہیں تھا۔مجھ میں جو وصف ہے،وہ تمہارے سبب سے ہے۔تم میرے ماضی سے بخوبی واقف ہو،لیکن اب جہاں تمہارا سہارا نہ ہو،میں ڈوبنے لگتا ہوں۔میرا خیال تھا کہ تم حد درجہ خود پسند ہو،اس لئے تم سے محبت کا خیال پہلے مجھے نہیں آیا۔حتیٰ کہ تم سے اظہارِ محبت کے لمحے تک میں اس جذبے کی حقیقت سے متعلق واضح نہیں تھا۔اظہارِ محبت کے بعد ایک لمحے کو مجھے لگا کہ اوخدا،یہ میں نے کیا کر دیا ہے،لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے تو اپنے دلی جذبات تمہارے آگے بیان کر دیے۔میرے دل نے پہلے وہ کہہ دیا جو میرے دماغ کے علم میں نہیں تھا۔اور پھر پیار مجھے ایک سیلابِ بلا کی مانند بہا کر لے گیا۔اس نے مجھے انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے لیکن یہ جان لو کہ میں اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کر چکا ہوں۔اور مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ کیا تم واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے؟!

میری جان سے پیاری! تم جتنا بھی وقت نکال سکو،میرے لئے بہت ہوگا،میں مزید کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ہم دونوں کے مابین اب باطنی ہم آہنگی اس قدر مضبوط اور مستحکم ہے کہ اس پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ہاں جب یہ دن گزر جائیں گے اور تمہاری آواز و عکس دھندلا جائیں

گے، تب بلاشبہ یہ سب اتنا آسان نہ ہوگا۔ تمہاری ایک تصویر میرے لئے ضروری ہے، اس کے بغیر تمہاری شکل میرے حافظے میں محفوظ نہ رہ پائے گی۔

آج کا دن کل سے کس قدر مختلف ہے۔ میں نے خاموشی سے طے کرلیا ہے کہ اب ہمیں ایک دوسرے کو الوداع کہہ دینا چاہیئے۔ تم نے مجھے اس قدر مسرت دے دی ہے کہ یہ عارضی جدائی اب میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھ سکتی۔ تمہاری محبت میرے تمام دکھوں کا مداوا ہے۔ اس لئے میں نہایت شاداں ہوں۔

برسوں بعد میں نے پھر شاعری کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے ایسا کوئی شاعر نہیں ہے، جو تمہارے سحر سے بچ سکے، یا میں اُسے تم سے متاثر نہ کر سکوں۔ میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں، لیکن پھر سوچتا ہوں تمہارے پاس تو پہلے ہی بہت کچھ ہے۔ میں حسن سے پیار کرتا ہوں، کیونکہ میں ایسے جی نہیں سکتا، جیسے مجھے جینا پڑتا ہے۔ اب سب ختم ہو چکا ہے۔ آج کی رات میں مزید کچھ نہیں لکھ سکتا۔

تمہارا اور صرف تمہارا

'بی'

مسورز گارڈن

چائنی واک

3 اپریل 1911ء

پیاری محبوبہ!

آج رات تمہارا خط ملنا باعثِ مسرت تھا۔ تمہارے لئے ہونے والی بے قراری نے مجھے بے چین کردیا تھا۔ سارا ماحول بے کیف تھا، اور ایلس کو جھیلنا اب تکلیف دہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے

بدلے ہوئے حسنِ سلوک سے مجھے کسی سازش کی بو آتی ہے۔ بہرحال کسی اسکینڈل سے بچنے کے لئے میرا فی الوقت اس کے ساتھ رہنا لازم ہوگا۔ اس نے مسز وائٹ ہیڈ سے ہمدردی اور ملاقات کے لئے خط لکھا۔ تب وہی ہوا، جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اس نے معمول سے زیادہ سچائی سے کام لیا۔ میں نے صلاح دی کہ ہم طلاق کے بعد بھی اپنی دولت کو مشترکہ رکھیں۔ لیکن اس نے میرے ایک پیسے کو بھی ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک رکاوٹ آن پڑی ہے۔ علاوہ ازیں اس نے (طلاق کا) اپنا ارادہ بھی تین ماہ کے لئے ملتوی کر دیا ہے اور میں نے طے کیا ہے کہ فی الحال کسی حتمی فیصلے سے گریز کرتے ہوئے، دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ میرے علم میں لائے بغیر اس نے تین کمیٹیوں سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اس کا یہ فعل بھی یہ مزید مشکلات کا سبب بن سکتا ہے۔

بدھ تک مجھے مسز وائٹ ہیڈ سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تمہارا خط ملنے سے پہلے اس کی یہ رائے تھی کہ ہمیں وقتاً فوقتاً کارلائل اسکوائر پر ملتے رہنا چاہئے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کے ملازمین (ہمارے) اس معاملے کی بھنک پڑ جائے یا اس کے بیٹے کو پتہ چل جائے۔ وہ نہایت حساس اور تیز طبع ہے، اس نے تمہیں دیکھ لیا تو اسے اندازہ ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے اسے مزید درخواست نہ کرنے کا فیصلہ کیا، حالانکہ مجھے پتہ ہے کہ میرے کہنے پر وہ نیک خاتون انکار نہیں کر پائے گی۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ ہمیں کنگسٹن گارڈن جیسے مقامات سے بھی گریز کرنا چاہئے۔ وہاں تو ہمارے سبھی جان پہچان والے احباب کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں یہ منصوبہ بنا رہا ہوں کہ ہم کسی زمین دوز اسٹیشن کے بیرونی رستے پہ مل لیں۔ اور پھر کسی دور دراز مقام جیسے پٹنی ہتھ چلے جائیں، جہاں ہم اطمینان سے چہل قدمی کر سکیں۔ یہ کوئی شاندار منصوبہ نہیں لگ رہا لیکن فی الحال میرے ذہن میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں سوجھ رہی۔ اگر ممکن ہوا تو میں پونے سات بجے واٹرلو سے روانہ ہوں گا۔ تمہارے لئے میں ولیم گرین کے رستے کی تجویز دے سکتا ہوں، جہاں تم پندرہ منٹ میں زمین دوز چیرنگ کراس سے پہنچ سکتی ہو۔ تمہارے ذہن میں اگر اس سے بہتر کوئی منصوبہ ہو تو میں اس پر بھی عمل کرنے کو تیار ہوں۔

میں اس پر کئی بار سوچتا رہا ہوں کہ تمہیں کیا تحفہ پیش کروں۔ میں اس معاملے میں ہنری جیمس کے کردار کی سی کشمکش میں مبتلا رہا۔ میرا خیال تھا کوئی ایسی چیز ہو جو تمہیں بھی پسند آئے نہ کہ صرف مجھے۔ میں نے ایک چھوٹی سی جلد والی خوبصورت کتاب منتخب کی۔ تب مجھے ان تمام پسندیدہ نظموں کا خیال آیا۔ کبھی کبھار شیکسپیئر کے گیت بھی مکمل ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ Hark, Hark The Lark............لیکن اس کے سانیٹ میں، میرے خیال میں تخلیت کچھ وافر ہے، اس لئے اس کا خیال مجھے سب سے آخر میں آیا۔ مجھے لگا کہ اس میں خاص قسم کی عمومی حس موجود تھی جس نے اسے ایک کامیاب شخص بنایا۔ گو کہ اس حوالے سے بعض استثنیٰ بھی موجود ہیں، اس کے باجود مجھے وہ کافی محدود پن کا شکار لگتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے ایک بار کہا تھا کہ میں جو چاہتا تھا، میں نے وہی پایا۔ میں دراصل اپنے باطنی جذبات تم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ شیلے اور بلیک کی نظمیں میرے ان احساسات سے زیادہ قریب ہیں۔ شیلے بچپن سے میرا پسندیدہ شاعر رہا ہے۔ میں اس کا مطالعہ کبھی کبھار ہی کرتا ہوں، لیکن وہ ہمیشہ میرے خیال میں رہتا ہے اور میں اسے بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ بلیک کی بھی چند نظمیں بہت خوبصورت ہیں؛ ''ٹائیگر، ٹائیگر''، ''سنو فلاور''، ''گارڈن آف لو'' اور "The Pebble and the Cold"، میں ایک مدھر گیت کا سا احساس ہے۔ اب اگر چہ یہ مجھے یاد نہیں لیکن اسے دہرانے کا یہی سب سے بہتر وقت ہے۔ بدھ تک میں خوشی سے مسرور ہوں۔ مجھے ادب میں کوئی چیز اپنے جذبات کی ترجمان نہیں دِکھتی۔

سیمب سے متعلق میں مطمئن ہوں۔ تم زوال اور اس کے مابین رکاوٹ ہو۔ مجھے اس کا بھائی بھی پسند ہے، گو کہ وہ تھوڑا سا ضدی ہے اور اکثر مجھے مغموم کرتا رہتا ہے۔ لیکن مروت کئی چیزوں کو قابلِ برداشت بنا دیتی ہے۔

ہاں، اے جانِ من! ہمارے خیالات اور احساسات میں میرے گمان سے کہیں زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ہمیشہ یونہی سمجھو گی۔ گو کہ میں جانتا ہوں کہ بعض معاملات میں، میں عجیب الطبع ہوں، کیونکہ کچھ چیزیں مجھ پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ میں

تمہیں سمجھ جایا کروں گا۔

اب میں کسی کو بھی غور سے سن نہیں پاتا کیونکہ میرے دل ودماغ پہ تم چھائی ہوئی ہوتی ہو۔ جانِ جاں! تم نے میرے اندر پیار کی جوت جگادی ہے۔ میں اسے ہمہ وقت اپنے اندر روشن پاتا ہوں۔ یہ ہمیشہ مجھے پرنور رکھتی ہے۔ اس سے مجھے یک گونہ راحت اور سکون ملتے ہیں۔ میری روح زخم خوردہ اور بے چین تھی۔ میں سچائی کو ہر چیز سے اہم سمجھتا تھا۔ اس کے لئے ہر چیز قربان کر سکتا تھا۔ اس سے مجھ میں ایک سختی آ گئی تھی۔ بعض اوقات میں بے رحم بن جاتا تھا۔ لیکن اب میں سچائی کے ساتھ ساتھ دوسری صداقتوں کو بھی جگہ دینے لگا ہوں۔

جانِ جہاں! تمہاری محبت میرے لئے مسرت کی انتہا ہے، بلکہ یہ مسرت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس نے میرے خیال کی کثافت کو صاف کر دیا ہے۔ اس نے جلاوطنی میں گھر کی یاد کی اذیت کو کم کر دیا ہے۔ اس نے میرے اندر حسن کی عبادت کو پھر سے بیدار کر دیا ہے، جو میں ایک عرصے سے ترک کر چکا تھا۔ مجھے حیرت ہوگی اگر تم نے ریاضی سے محبت سے متعلق میری تحریر کا مطالعہ کیا ہو۔ تم ان باتوں کو شاید آسانی سے سمجھ لو، اور چند جملے تو بخوبی سمجھ سکتی ہو۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں زندہ کیسے رہا ہوں۔ مجھے آخر میں معلوم ہوا کہ ریاضی کی محبت خشک اور جواب دینے سے قاصر ہے۔ اس لئے اس سے تحرک حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اب مجھے خط کو ختم کر لینا چاہئے۔ رات کے دو بجنے والے ہیں۔ الوداع، الوداع۔

تمہارا خط واقعی مسرت سے بھرپور تھا۔ جانِ تمنا، میں تمہاری قربت کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ مجھے خود یقین نہیں آ رہا کہ میں اس قدر شدت سے محبت میں مبتلا ہو سکتا ہوں۔

میرے دل، میری روح، الوداع!

'بی'

فرن ہرسٹ

13اپریل، 1911ء

میری جان سے پیاری!

تمہارا خوبصورت خط ابھی ابھی ملا۔ مجھے واقعی افسوس ہے کہ اپنے ڈپریشن کی وجہ سے میں نے تمہیں پریشان کیا۔ گو کہ یہ اب ختم ہو چکا ہے، لیکن یہ واقعی حقیقی تھا۔ اس لئے تم سے اس کا اظہار کرنے پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ وہی تھا جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں تو صرف محبت کے اصولوں پر عمل کر رہا تھا۔ لیکن تمہیں یہ بھی تو نہیں بھولنا چاہئے کہ تمہاری قربت میں ہی میرا ڈپریشن ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ مت سوچنا کہ اس کا تعلق تمہارے حوالے سے ہے۔ میں تم سے کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ تم میرے تخیل سے کہیں زیادہ پُرکشش ہو، اور میں نے شدت سے کبھی کسی عورت کو نہیں چاہا، جس قدر شدت سے میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تم شاید سوچ رہی ہو کہ میں چاہتا ہوں کہ تم ذہین و فطین ہوتیں۔ لیکن میں نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ تم جیسی ہو، میں تمہیں اسی حال میں پسند کرتا ہوں۔ لوگوں کی ذہانت سے متعلق میری رائے، انہیں چاہنے یا نہ چاہنے پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتی۔ خالصتاً دانشورانہ سطح پر شاید ہی میں کسی سے ذہنی لگاؤ محسوس کرتا ہوں، کیونکہ دانشورانہ امور میں باآسانی اشتراک ممکن نہیں ہوتا۔ گو کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں وائٹ ہیڈ کے ساتھ تبادلہ خیال کر سکتا ہوں لیکن تمہارے ساتھ میں اس نوعیت کا تعلق نہیں چاہتا۔ اس لئے دانشورانہ حوالے سے میں تم سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ میرے اردگرد کی دنیا ذہین افراد سے بھری پڑی ہے۔ ان میں سے بعض اس قدر ذہین ہیں کہ جس چیز کو بھی میں اہمیت دیتا ہوں، یہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ سنجیدہ لوگ اپنے باطن میں چالاک نہیں ہوتے۔ اگر وہ ایسے دکھائی دیتے ہیں تو یہ صرف ان کا ظاہری روپ ہوتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ فرد اہم چیزوں سے متعلق کیا محسوس کرتا ہے۔ تمہاری محسوسات مجھ سے کہیں بہتر ہیں، اور بالکل ویسی ہی جیسی میری ہونی چاہئے تھیں۔ جب میں نے اس

مختلف بات محسوس کی تو یقیناً میں تمہیں اس سے آگاہ کروں گا۔ کیونکہ میرے نزدیک سچائی اور سچائی کے علم سے بڑھ کر کوئی چیز لائقِ ستائش نہیں۔

ہاں تو جانِ تمنا! تمہیں ملاقات کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے۔ تم ضرور مجھ سے ملنے کیمبرج آؤ۔ میں اپنے کمروں میں تمہارے وجود کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری گذشتہ آمد اس حوالے سے ناکافی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے طرزِ زندگی سے پوری طرح واقف ہو جاؤ۔ لیکن اصولاً مجھے لندن آنا چاہئے۔ مجھے جلد سے جلد چیلسیا میں ایک چھوٹا سا گھر دیکھنا ہے، لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔

میں تمہارے بالوں کو دو چٹیوں میں گندھا ہوا اور نہایت توبہ شکن دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب میں آؤں گا تو ہم کتنے خوش ہوں گے۔ میں خود کو یوں مسرور محسوس کروں گا جیسا کہ ایک نوجوان لڑکا سکول سے ہونے والی چھٹیوں کا سن کر گھر آ کر خود کو مسرور محسوس کرتا ہے، اور ارد گرد کی ہر چیز سے بے گانہ جاتا ہے۔

ہاں یہ درست ہے کہ بعض اوقات کسی کے جذبات کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ واقعی اس قدر حقیر ہوں۔ میں تمہاری محبت کی قدر و قیمت کو ایک لمحے کے لئے بھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ میں اس کے اسباب و علل سے تو آگاہ نہیں، لیکن مجھے شروع سے ہی یہ یقین تھا کہ ہمارا پیار عظیم، گہرا اور حقیقی ہے۔ میرے اس قدر جلد یقین کر لینے کا سبب یہ تھا کہ میرے علم میں آئے بغیر یہ محبت میرے دل میں بڑھتی چلی گئی، اور ایک دم میرے دل میں پھوٹ پڑی۔ میں اپنے جذبات اور احساسات تک سے بے خبر رہا۔ تب ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ تم کس قدر پُرکشش شخصیت کی مالک ہو۔ جتنا میں تم سے متعلق سوچتا تھا، اس سے کہیں زیادہ تمہارا جوابی پیار میرے لئے غیر یقینی اور ندرت کا حامل تھا۔ البتہ ڈپریشن کے دوران میں نے محسوس کیا کہ زندگی میں خود زندگی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ میں بچوں سے حاصل ہونے والے حظ کا متمنی ہوں، لیکن یہ لایعنی خیال ہے۔ کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ تمہارا کوئی بچہ ہے! اگو کہ میرا کوئی بچہ نہیں ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ بچے کا

ہونا خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

کیا میں جولین سے دوستی کر سکتا ہوں؟ میں اب بھی اسے پسند کرتا ہوں۔ اگر میں اس کا اظہار کر دوں تو شاید وہ بھی مجھ سے پیار کرے گی۔ لیکن اگر اس نے میرا ذکر فلپ سے کر دیا تو یہ اسے پاگل کر دینے کو کافی ہوگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بے خبر ہی رہے تو بہتر ہے۔

ناشتہ بہت دیر سے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ الوداع۔

جانِ جاں، تم تصور میں مجھے مسرور و شاداں محسوس کرو۔ میں گھنٹوں تمہارے تصور میں محو ٹہلتا رہتا ہوں۔ میری جان، میں تمہیں چاہتا ہوں، میں تم سے مکمل وصل چاہتا ہوں۔

الوداع، الوداع!

'بی'

ٹرینٹی کالج

22 اپریل 1911ء

بہت، بہت، بہت ہی پیاری!

یہاں پہنچتے ہی تمہارا پیار بھرا خط ملا۔ تمہارا خط ملنا بہت ہی مسرت آمیز تھا۔ میں یہ تصور ہی نہیں کر پاتا کہ ہم جدا ہو چکے ہیں۔ تم نے اس قدر مسرور کر دیا ہے کہ خوشی میرے اندر سے پھوٹی پڑ رہی ہے۔ یہاں مجھ سے ہر شخص یوں ملتا ہے جیسے میں کسی خوفناک کہانی کا کردار ہوں۔ جیسا آبنائے برطانیہ میں سفر کرتے ہوئے کسی بیماری کا شکار ہو جانے پر ہوتا ہے۔ لیکن میں اس سے مختلف محسوس کرتا ہوں۔ پروفیسر ہاسن نامی ایک آدمی مجھے ملا جو اس بات پر بہت مسرور تھا کہ وہ بتیس برسوں میں پہلی بار اس دفعہ لیکچر نہیں دے رہا۔ زندگی کس قدر حیرت ناک ہے!

میں اس دنیا کے ساتھ جدوجہد کر رہا ہوں۔ میں اس میں اپنی جگہ بغیر کسی خامی کے تلاش

کرنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ضروری چیزیں کہاں پڑی ہیں۔ خلا میں مادہ کہاں بکھرا ہے۔ اس سرگرمی کو میں ناپسند کرتا ہوں جس سے حاصل کچھ بھی نہ ہو۔ میں اہم شخصیات سے ملتا جلتا رہتا ہوں۔ ہفتے میں صرف دو لیکچر دیتا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ انفرادی طور پر پڑھاتا بھی ہوں۔ مجھے لندن آنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوگی، اور مجھے اس کی خواہش بھی ہے۔

امریکہ سے مجھے ہینڈرسن نامی آدمی کا عجیب و غریب خط ملا جو یونیورسٹی آف کیرولانا میں 'خالص ریاضی' کا پروفیسر ہے۔ اس نے شاہ کی سوانح تحریر کی ہے، جس کی کاپی اس نے مجھے بھیجی ہے۔ وہ لمبا اور بے ڈول ہے۔ میرے پہلے لیکچر میں شریک ہو چکا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس نے کچھ زیادہ سیکھا ہوگا۔

آج ڈبلن جا کر میں نے آئرلینڈ کے رائل آسٹرونیومر میں لیکچر دینے کی پیش کش ٹھکرادی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے ہاں کے فرائض ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ میرا خیال ہے کہ بعض اوقات فرائض بھی فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔

تمہارا قلم بہت خوبصورت ہے۔ میں اب اسے استعمال کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ یہ میرے بارے میں تمہارے خیالات تحریر کرے۔ لیکن افسوس کہ قلم ایسا نہیں کر سکتا، اور یہ ایسے لکھتا ہے جیسے کبھی تمہارے پاس نہیں رہا۔

یہ بالکل ویسی جگہ ہے جس سے میری ذات کا مہذب حصہ تعلق رکھتا ہے۔ میں ان عمارتوں اور کمروں کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں دانشورانہ باتوں کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن میری ذات کا دوسرا حصہ یہاں کی پابندی اور مصنوعی پن سے، حقیقی زندگی جیسی چیز کی غیر موجودگی، اور جسم کی عدم ہم آہنگی سے بیزار ہے، جو ہمیشہ تکلیف دہ اور بیزار کن ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو ایک مہم کے طور نہیں دیکھتے۔ خاموش عمارتیں، بند گنبد انہیں اچھے لگتے ہیں۔ یہ افسوس ناک بات ہے۔ تھوڑی سی مہم جوئی ان کے کام کو بہتر بنا سکتی ہے۔

جانم! اب میں لکھنا بند کرتا ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد میں خط کو مکمل کروں گا۔

....

یونا برک(Una Birch) نے خفیہ معاشروں اور فرانسیسی انقلاب سے متعلق اپنی کتاب بھیجی ہے۔ میں اس کے کچھ حصے مضامین کی شکل میں پڑھ چکا ہوں۔ مجھے اکثر یہ لگتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ دلچسپ انداز میں لکھ سکتی تھی۔ اس کے احساسات طاقتور اور حقیقی ہیں۔ اس کا ذہن بالکل واضح ہے۔ میرے خیال میں وہ کیونکہ اپنے معاملات سے متعلق بہت زیادہ حساس ہے، اور اس کا تخیل بھی کمزور ہے، شاید اسی لئے تاریخی واقعات سے متعلق اس کا نقطہ نظر واضح نہیں۔

میں نے میگ ٹیگرٹ کے ساتھ کھانا کھایا، لیکن مجھے اس میں زیادہ دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ جگہ اور کام مجھ پر بہت اثر ڈالتے ہیں۔ کام آدمی پر اس کے خیالات سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

کیا تم نے اس ہفتے کے 'نیشن' میں مسز وائٹ ہیڈ کی کوئی تحریر دیکھی؟ انہوں نے کافی عرصے سے بھیج کر رکھی ہے، لیکن اب تک شائع نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں وہ ایک اچھی تحریر تھی۔

جاناں! تم نے مجھے وہ خوشیاں دی ہیں، جن کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ تمہارا خیال آتے ہی میرا دل باغ و بہار ہو جاتا ہے۔ آج دوپہر میں نے خط لکھنا بند کیا۔ میں غروب ہوتے سورج اور پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سننے کے لئے باہر نکلا۔ مجھے ہر چیز پہلے سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت محسوس ہوئی۔ باغ میں کھلے رنگا رنگ پھول اتنے حسین لگے کہ پہلے کبھی نہ لگے تھے۔

جانِ جاں! میں یہ سن کر نہایت شاداں ہوں کہ تم اپنے زندگی کے اہم معاملات پر مجھ سے بات کرنا چاہتی ہو؛ اس لڑکے سے متعلق جو اَب اس دنیا میں نہیں رہا، اور وہ سب کچھ جو تم محسوس کرتی ہو۔ تم اگر فلپ سے متعلق بات کرنا چاہو تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔

جانِ تمنا! تمہارا پیار مجھے نہایت بھرپور نظر آتا ہے۔ میں اس سے زیادہ بھرپور محبّت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں اب بھی تمہاری بانہوں کے گھیرے کو، تمہارے بوسے کو اور تمہارے خیرہ کر دینے

والے حسن کو محسوس کر سکتا ہوں، اور تمہاری مدھر آواز کو سن سکتا ہوں۔ اب تم سے جدا ہو کر زندہ رہنا میرے لئے اتنا مشکل نہیں رہا، کیونکہ تمہاری قربت میں گزرے ان تین دنوں کے ہر لمحے کو میں دوبارہ جی سکتا ہوں۔ اب الوداع، جانِ بہار۔ ان تین دنوں میں میری محبت مزید گہری ہو چکی ہے۔ ہزار گنا بڑھ چکی ہے۔ تمہیں مکمل جان کر، تمہارے مکمل وصل میں بھیگ کر۔

میری آٹولن، الوداع۔ میرے تصور میں بس تم ہی تم ہو!

'بی'

ٹرین میں

2 مئی 1991ء

صبح ساڑھے پانچ بجے

میری پیاری!

تم اس خط کی طوالت کا اندازہ کر سکتی ہو کیونکہ تم جانتی ہو کہ میرے پاس کاغذ کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل ہمارے وائٹ ہیڈ کے ہاں جانے اور تمہاری تھکاوٹ نے ہمیں خاصا پریشان کیا۔ اور اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پریشانی کے دوران میری تم سے انسیت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اب مجھے لگتا ہے کہ کسی مشکل یا خراب حالات میں ہمیں ایک دوسرے کے پاس ہونا چاہئے۔

Boer War سے پہلے میں ایلس کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ اتنی مطمئن کہ میں کسی اور چیز سے متعلق سوچنے کی مجھے ضرورت تھی نہ فرصت۔ ایلس کو اس پر حسد ہوتا تھا۔ وہ ایک غیر ملکی تھی، اس لئے وہ ایسے وقت میں وطن کے لئے ایک فرد کے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ گو کہ جنگ ہمارے بیچ خلیج کی اصل وجہ نہ تھی۔ جنگ کی شروعات سے قبل ہم تقریباً شاہ پرست تھے۔ جنگ کے دوران بعض دیگر وجوہات کے باعث مجھ میں تبدیلی آئی۔ جس نے میرے اندر

انسانیت کی جوت جگا دی، طاقت کا خوف پیدا کیا اور حادثاتی طور مجھے Boer کا حامی بنا دیا۔ ایلس متعجب ہوئی اور اسے یہ بات ناگوار گزری۔ مجھے یاد ہے ایک روز ہم چند احباب سے باتیں کر رہے تھے تو اس نے یونہی سرسری انداز میں کہا کہ وہ مجھ جیسا بچہ پسند نہیں کرتی۔ مجھے لگا کہ وہ میری سب سے اچھی چیز کو ناپسند کر رہی ہے۔ نیز یہ کہ اسے میرے ردِ عمل کی کوئی پرواہ ہی نہیں۔ یہ واقعی صحیح تھا، اور اُسے اِس کا اندازہ مجھے کھو دینے کے بعد ہوا۔

یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ ہم دراصل ان لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگی میں غم بڑی جلدی در آتے ہیں۔ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ خوشی کے محدود لمحوں میں ہم انہیں بھلا دیں۔ خوشی کے لمحوں میں انسان کو بہت کچھ ممکن نظر آنے لگتا ہے، اور ایسا نہ ہو تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔ جانِ من، میرے کام کی فکر نہ کرو۔ مجھے صرف ایک چھوٹی سی کتاب ''مسائلِ فلسفہ'' کے سلسلے میں تحریر کرنی ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس زیادہ تخلیقی کام نہیں ہے۔ اب تو مجھے خود پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنا زیادہ کام میں کیسے کرتا رہا ہوں۔ سو، آنے والے برسوں کے لئے پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

کل تمہیں خوش کرنے کے لئے میں نے بات کرنے کی کوشش کی اور پھر نہ کر سکا۔ میں ان تمام باتوں پہ غور کرتا رہا ہوں جو میرے عقیدے کا حصہ ہیں۔ یہ نہایت حقیقی ہیں۔ لیکن ان کا صرف اس لئے استعمال کرنا کہ تم مجھ سے محبت کر سکو، ایک جرم ہوگا۔ اس لئے مجھے لگتا ہے کہ ان سے متعلق مجھے تبھی بات کرنی چاہئے جب میرا ذہن صاف اور جذبات معمول پر ہوں۔ خوش قسمتی سے تمہارے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے۔

تمہیں جاننا ایک ایسی مسرت ہے، جس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ میں جان گیا ہوں کہ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں بدلتا ہے۔ جب اس پر سنجیدگی طاری ہو تو مجھے اس پہ بہت پیار آتا ہے۔ لیکن تمہارا قہقہہ بھی میرے لئے اتنا ہی مسرت آمیز ہے۔ جانِ جاں! تمہیں پا کر میرا دل مسرت سے چھلک رہا ہے۔ تمہارے بنا میں دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے برسوں تمہیں تلاش کیا ہے۔ اکثر مجھے لگتا تھا کہ یہ سعیِ لاحاصل ہے، اور میں امید کھونے لگتا تھا۔ گو کہ میرا مزاج بار بار

بدلتا رہتا ہے، لیکن تم میرے ہر مزاج کی ساتھی ہو۔ سوائے سخت دانشورانہ مزج کے، جو کسی دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ مجھے نہیں پتہ ایک طویل عرصے تک تمہیں میری یا مجھے تمہاری ضرورت رہے گی یا نہیں۔ اس کے باوجود تم میرے اندر ایسا بہت کچھ محسوس کر سکتی ہو جو تمہیں اچھا لگے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں جو چیز تمہیں ناپسند ہے، وہ میرا نامخلص پن ہے۔ جیسے کہ میں چالاک لوگوں کو پسند کرتا ہوں یا ان جگہوں کو ناپسند کرتا ہوں جہاں میری حقیقی قدر و منزلت نہ ہو۔ لیکن اگر تمہارا ساتھ برقرار رہا تو تم جلد اپنے ناپسندیدہ آدمی کو مجھ میں نہیں پاؤ گی، اور شاید وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا ہے۔

کل مجھے تمہارے ساتھ اُس جگہ جانے میں خوشی ہوگی جہاں میرا بچپن گزرا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں روشن دنوں میں اپنی نانی اماں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ وہ ہوتیں، تو تمہیں بہت پسند کرتیں۔ کیونکہ وہ تمہیں بہت خوبصورت پاتیں، اور خوبصورتی کے لئے وہ نہایت قابلِ ستائش جذبات رکھتی تھیں۔ وہ بھی تمہیں پسند آتیں۔ کیونکہ (تمہاری طرح) وہ بھی سخت مذہبی اور اس دنیا سے لاتعلق تھیں۔ ان میں اخلاقیات مگر بہت گہری تھیں۔ شاید وہ تمہیں کچھ سخت گیر لگتیں۔ اپنے اکثر ہم عمروں کی طرح ان میں بھی مروت کی کمی تھی۔ انہیں کبھی اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ وہ میرے بھائی سے کتنی کدورت سے پیش آتی ہیں۔ میری سچائی کی جستجو انہیں بے معنی لگتی تھی۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ مجھے ان باتوں سے متعلق نانی اماں کو کچھ نہیں بتانا۔ سیاسی لحاظ سے وہ نہایت سخی اور نڈر تھیں۔ ذاتی طور پر ان کا اعتقاد تھا کہ قابلِ ستائش قدر صرف نیک دلی ہے۔ گو کہ وہ دنیاوی معاملات سے قطعی طور پر لاتعلق رہتی تھیں لیکن میری شادی کی انہوں نے کھل کر مخالفت کی۔ اس لئے زندگی کے آخری ایام میں مجھ سے وہ بے اعتنا رہیں۔ لیکن ان کی موت پر مجھے دلی طور پر صدمہ ہوا۔ اب مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو انہیں الزام دینے کو جی نہیں چاہتا۔

لیکن اے جانِ جاں! میں تو تمہیں صرف اپنی محبت سے متعلق بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے اتنی محبت کبھی محسوس نہیں کی جتنی کل کی۔ اس لئے میں اس قدر افسردہ ہو گیا۔ محبت حد سے بڑھ

جائے تو آدمی کو افسردہ کر دیتی ہے۔ یہ مجھے مکمل طور پر اپنے اندر جذب کرتی جا رہی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کاش میں ریاضی دان نہ ہوتا، کیونکہ تم ریاضی دان نہیں ہو۔ میں خود کو کلی طور پر تمہاری نذر کرنا چاہتا ہوں، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں تمہیں کچھ دینا بھی چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک دوسرے سے دل کی ساری باتیں کہہ دینے کے لئے یہ ایک زندگی ناکافی ہے۔ تمہارا بوسہ لیتے ہوئے میں مسرت کی انتہا پہ ہوتا ہوں۔ یہ بوسہ جسمانی طور پر کم ہوتا ہے کیونکہ ساتھ ہی ہماری روحیں ایک دوسرے کا بوسہ لے رہی ہوتی ہیں۔ تب ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو تم نہایت حسین و جمیل نظر آتی ہو مگر مجھ سے کہیں دور............ تب مجھے یقین نہیں آتا کہ میں نے تمہارا ہی بوسہ لیا تھا۔ تمہارے لمس کے بنا میں خود کو عالمِ خواب میں محسوس کرتا ہوں۔ اور جب ہم روایتی طور پر ایک دوسرے کے قریب تھے، تب مجھ پر منکشف ہوا کہ ہم ایک دوسرے کی روحوں سے آشنا ہیں!

'بی'

17۔ کارلائل

28 مئی، 1911ء

میری زندگی!

لندن میں اتوار کا دن خاصا بیزار کن ہوتا ہے۔ کوئی خط نہیں ملا۔ میں نے اپنا خط ساؤتھ ویسٹرن ڈاک خانے جا کر ایک ڈاک کے حوالے کیا، جو تمہیں کل صبح مل چکا ہے اور امید ہے کہ تم مجھے فوراً اس کا جواب لکھو گی۔

وائٹ ہیڈ کے ساتھ میری ایک طویل اور تکلیف دہ نشست ہوئی۔ اس سارے معاملے نے مجھے تھکا دیا اور سر درد میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ اگر ایلس طلاق حاصل کرنا چاہتی

ہے تو میں اسے بوگس شہادتیں مہیا کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ ایلس اس پر تیار نہیں ہوگی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ تمہیں اس معاملے میں ملوث کرے گی یا نہیں۔ مجھے اس حوالے سے کوئی پریشانی نہیں کہ میرا کوئی قریبی دوست بھی اس لغویات پر یقین نہیں کرے گا۔ میرے خیال سے یہ ایک زبردست منصوبہ ہے۔ ایلس اگر خود چاہے تو اسے آزادی ملنی چاہئے۔ اور اگر وہ میری پیشکش کو رد کرتی تو وہ صرف مجھے نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ گو کہ اس بات کا اقرار خود سے بھی نہیں کر سکتی۔ ایلس اور لوگان نے جو کہا تھا، مجھے وہ کل دوپہر معلوم ہوا۔ بظاہر وہ یہ بات اپنے سارے خاندان کو بتانا چاہتے ہیں، لیکن اس طرح پھر ان کے لئے کچھ نہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

آج وائٹ ہیڈ کہیں گئے ہوئے تھے۔ اس لئے میں سنگرز کے ساتھ کھانا کھانے چلا گیا۔ وہ جلد ہی کھیلنے چلا گیا، اور میں ڈورا کے ساتھ رہ گیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ اچھے برتاؤ سے پیش آئی مگر لاتعلق سی رہی۔

جانِ عزیز! تم اگر میرے ساتھ تعلق کا خاتمہ چاہتی ہو تو اب بھی وقت ہے۔ اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ ایلس انتقامی طور پر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ گو کہ اپنے کئے پر وہ عمر بھر پچھتائے گی۔ لیکن پاگل پن کا نیم گھنٹہ بھی کافی ہوتا ہے۔ بہرحال، اگر تم ضروری سمجھتی ہو تو قطع تعلق کر لو۔ میں یہ وقت بھی گزار لوں گا۔ ضروری نہیں کہ یہ ہمیشہ کے لئے ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں کوئی بھی فیصلہ میری غیر موجودگی میں کرنا چاہئے۔ تمہارے فیصلے کے بعد میں تم سے دوبارہ نہیں ملوں گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ قطع تعلق کئے بنا تم محفوظ رہ سکتی ہو۔ امید تو ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا، پر اس کا پورا یقین بھی نہیں۔

بوگس کیس کا ایک فائدہ بھی ہے، اگر وہ قبول کر لے تو اس کی قوت ختم ہو جائے گی اور وہ مزید کچھ نہیں کر پائے گی۔ یہ بات میرے حق میں جائے گی۔ اس کے تسلط میں رہنا ناقابلِ برداشت ہے۔ اور طلاق تک یہ صورتحال برقرار رہے گی۔ تمہیں اس بات پر یقین نہیں کرنا چاہئے کہ تم میرے لئے قربان ہو رہی ہو۔ ایلس سے رہائی کی خوشی مجھے، اس مقدمے کی ذلت کے صدمے سے بچا لے گی۔ یہ صورتِ حال بہرحال میرے دوستوں پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرے

لئے صرف ایک چیز کی اہمیت ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ اپنی شہرت سے متعلق مجھے زیادہ فکر نہیں۔ فکری طور پر اور عمومی فائدے کے لحاظ سے بھی یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے۔ کیونکہ اگر تمہارے بغیر زندگی گزارنا پڑی تو مجھے کام کے لئے درکار توانائی حاصل نہ ہوگی۔ یہ سب باتیں میرے دماغ میں گھومتی رہیں گی۔ میں پاگل ہو جاؤں گا اور چاہوں گا کہ یہ سب کسی طرح ختم ہو جائے، مگر کیسے، معلوم نہیں۔

وائٹ ہیڈز مجھے اکثر پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مجھے پھر اپنا ہنس مکھ موڈ بحال کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ اس باران کی باتیں زیادہ مدلل تھیں۔

یہ ایک احمقانہ خط تمہیں بھیج رہا ہوں۔ شاید میں دیوانہ ہو چکا ہوں۔ اس کے سوا میں اور کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اور کئی بات میرے احساسات سے ہم آہنگ نہ ہوں گی۔ لیکن تم پریشان مت ہو، میں گذشتہ دو، تین روز سے ڈپریشن میں مبتلا تھا۔ جب میں تمہارے ساتھ ہوتا ہوں تو بے انتہا مسرت محسوس کرتا ہوں اور مستقبل سے لاپرواہ ہو جاتا ہوں۔ لیکن اب مجھے اس سے متعلق سوچنا ہوگا۔ کیونکہ بہرحال معاملات کو طے کرنا پڑتا ہے۔ اس جملۂ معترضہ کے لئے معذرت۔ اب میں سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ اے میری روح الوداع!

میں ایسا محسوس کرتا ہوں، جب سمندر کنارے کوئی سادہ لوح بچہ سوچتا ہے کہ کسی بھی لہر پر سوار ہو کر وہ چاند کو چھو لے گا۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ ایسا کرنا ناممکن ہے.........مگر میں اب بھی سوچتا ہوں کہ ایسا کرنا ممکن ہے!

'بی'

9۔کارلائل سکوائر

29 مئی، 1911ء

جانم!

اتوار کے بعد تمہارا دوسرا خط میرے لئے نہایت پر مسرت تھا۔لیکن مجھے اپنے خطوط کے ان تاثر پر افسوس ہے جنھوں نے تمہیں افسردہ کیا۔مجھ پر کئی باتوں کا برا اثر نہیں پڑتا بلکہ وہ میرے لئے معاملات کو سہل بنا دیتی ہیں،اور مجھے اخلاقی دباؤ سے آزاد کر دیتی ہیں۔جہاں تک پریشانی اور تشویش کا تعلق ہے،تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ کس قدر مہلک ہیں۔جبکہ میں حقیقتاً طوفانوں اور تشویش سے لطف اندوز ہوتا ہوں،لیکن صرف تم سے جدائی کا خیال ہے،جسے میں آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا۔کوئی چیز اگر اس سے کم ہو،تو میرے لئے قابلِ قبول ہوگی۔میں بعض اوقات محبت کے بارے میں عجیب محسوس کرتا ہوں۔تمہارے خطوط کی ضرورت اب مجھے پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔بہرحال،اب میں واضح بیان کرتا ہوں؛

(الف) میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور تمہاری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا۔میں دونوں باتیں چاہتا ہوں۔میں پوری ایمانداری سے کہتا ہوں کہ یہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔اگر انتخاب کرنا پڑا تو میں سب سے بہترین کا چناؤ کروں گا۔اس کے علاوہ زندگی میں باقی سب چیزیں لایعنی ہیں۔اس بارے میں تمہیں کسی شک میں نہیں رہنا چاہئے۔

(ب)اپنی زندگی میں فلسفہ کے حوالے سے کام کرتے ہوئے میں مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے،بیج میں تناور درخت بننے کا امکان ہوتا ہے،لیکن میں اب نوجوان نہیں رہا۔میں اپنی توانائی ایک بڑی کتاب پر صرف کر چکا ہوں۔اس لئے وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کسی دوسرے کام کے لئے اتنی توانائی نکال بھی پاؤں گا یا نہیں۔بہرحال اس حوالے سے سوچوں گا کہ کیا کرنا چاہئے۔

(ج) میں عمومی فلسفہ،مذہب اور اخلاقیات سے متعلق لکھنا چاہتا ہوں۔میں ایسا ضرور کروں گا چاہے مجھے کسی اور نام سے لکھنا پڑے۔میں سٹریف پر ایک گیت لکھنا چاہتا ہوں،جو میں دریا

سے متعلق تمہیں لکھا تھا۔

(د) میں مطالعہ کرنا پسند کرتا ہوں۔

ان چار نقاط کو میں نے اہمیت کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ سب سے پہلے درج کی گئی بات سب سے اہم ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن سے متعلق یقینی علم ہونا چاہئے۔ ایک یہ کہ ہمارے بیچ خواہ کچھ بھی حائل ہو جائے، میرے لئے وہ تمہاری مستقل جدائی سے کم نقصان دہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم جدا ہو گئے تو میری زندگی کی بہار ادھوری رہ جائے گی۔ میں بہت سرگرم ہوں، اور فی الوقت تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ اس معاملے کو از سرِ نو شروع کرنا آسان نہ ہوگا۔ مجھے بس یہ کرنا ہے کہ آرام سے بیٹھ جاؤں اور مذہب سے متعلق وہ باتیں کروں، جن پر ہم نے بحث کی تھی۔ بشرطیکہ میں اس کامیاب ہوسکوں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایلس کی کدورت میری کامیابی میں رکاوٹ ہوگی۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میرے لئے تمام باتیں نہایت سادہ ہیں۔ میری خوشی اور میرا کام تم سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے اکٹھے رہنے کی خواہ کوئی بھی قیمت ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور جہاں تک تمہارا تعلق ہے تمہیں اب فلپ اور مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینا چاہئے۔ اگر سمتھ کا اصرار برقرار رہے تو میرے خیال میں تمہیں میری قربانی دے دینی چاہئے۔ میں جدائی کے موقع پر اور بعد ازاں بھی کوشش کروں گا کہ یہ معاملہ تمہارے لئے زیادہ تکلیف دہ نہ بنے۔ لیکن اگر تمہیں یہ لگے کہ جس کی قربانی دینا لازم ہے وہ میں نہیں، تو مجھے خوشی ہوگی۔ لیکن جو بھی ہو تمہیں فلپ سے تعلق برقرار رکھنا چاہئے۔ میرے خیال میں اُس میں اور مجھ میں کوئی خاص تضاد نہیں۔ ہم دونوں تمہاری خوشی چاہتے ہیں۔ اگر وہ چاہے تو میں اب بھی اُس سے اِس معاملے پر غیر جذباتی انداز میں گفتگو کر سکتا ہوں، جیسے کہ یہ میرا معاملہ نہ ہو۔

جانِ جاں! تمہیں مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا چاہئے، خواہ یہ میرے لئے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ او میری جان، میں تمہارے لئے تڑپتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کل کا تمہارا بوسہ

مجھے عمر بھر خوش رکھنے کو کافی ہے۔ایسی محبت کا میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔اب لگتا ہے کہ مجھے اسے تم سے چھپا کر رکھنا چاہیئے تھا تاکہ یہ تمہاری آزادی میں حائل نہ ہو۔لیکن افسوس کہ ایسا میرے لئے ممکن نہیں۔تم جانتی ہو کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم آزادانہ طور پر اور اطمینان سے فیصلہ کر سکو کہ تم کیا چاہتی ہو۔تمہیں اس بات سے پریشاں ہونے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مجھے اس سے کوئی پریشانی ہوگی، کسی خجالت کا سامنا ہوگا، یا میں تم پر کسی چیز کو فوقیت دوں گا۔یہ تم ہمیشہ یاد رکھنا۔

اور ہاں اے میری زندگی! کل جو میں نے محسوس کیا، اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا۔زندگی، خوشی، سکون اور سب باتیں اب تم سے وابستہ ہیں۔تم سے دوری صدمہ، غصہ اور پریشانی ہے۔الوداع میری روشنی، میری زندگی!!

'بی'

معرفت مس مورس

پیاری محبوبہ!

جو کچھ مجھ پر بیتا، میں وہ سب تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں۔یہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔مسرت، خیالات، احساسات، بصیرت اور قوت کی نئی زندگی کا آغاز۔تمہارے ذریعے میں اپنی ہر تکمیل پا چکا۔وہ سب جو میں چاہتا تھا، تمہاری قربت نے مجھے عطا کر دیا۔میں نے ایسی محبت کا تصور بھی نہیں کیا تھا، جو تم سے مجھے ملی۔میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا میرے ساتھ ہوگا۔اب میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم مل کر وہ سب حاصل کر سکتے ہیں جس کا حصول تنِ تنہا ممکن نہیں۔تم نے نہ صرف مجھے اپنے خیالات سے بھر دیا ہے بلکہ مجھ میں وہ آرزوئیں جگا دی ہیں جو اس سے قبل مفقود تھیں۔میں تمہیں اپنے سارے خیالات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں لیکن اپنے تمام جذبات اور احساسات کو احاطہ تحریر میں لانا میرے لئے ممکن نہیں۔میرے لئے ساری دنیا بدل چکی ہے۔یہ اب پہلے سے زیادہ وسیع، آزاد، اور لامحدود ہو چکی ہے۔جو دھندلا تھا، واضح ہو چکا ہے۔لامحدود امکانات کو اب میں

ممکنات کے طور پر دیکھ سکتا ہوں۔ تم نے مجھے اپنے احساسات سے آگاہی دی۔ میں تمہارے ان احساسات میں شریک ہونے کو بے قرار ہوں۔ میں جب بھی خوشی کا تصور کرتا ہوں، تمہاری تصویر میرے ذہن میں ابھر آتی ہے۔

میری جان، میں تمہیں اپنے دل، روح اور ذہن سمیت پیار کرتا ہوں۔ میرا انگ انگ تمہارا ہے۔ میرے دل، شب بخیر۔ میری خواہش ہے کہ میں چار بوسوں سے تمہاری آنکھیں موند دوں!

تمہارا

'بی'

ٹرینٹی کالج

6 جون، 1911ء

میری پیاری!

مجھے نہیں معلوم کہ یہ خط مجھ سے پہلے تم تک پہنچ پائے گا کہ نہیں۔ لیکن میں تمہیں بتادوں کہ کچھ ہی دیر پہلے مسز وائٹ ہیڈ سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ ایلس سے مل کر آ رہی تھیں، اور ان کی زبانی معلوم ہوا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے وہ خطوط دیکھے ہیں جو ایلس نے ہماری علیحدگی سے متعلق لکھے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کیا شاندار خطوط ہیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ ایلس بڑے خوشگوار موڈ میں تھی اور بڑے اچھے انداز میں لکھنا چاہتی تھی۔ انہوں نے بڑی ہمدردی سے کہا کہ اب پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایلس بس یہ چاہتی ہے کہ میری طرف سے کچھ نہ کہا جائے۔ انہوں نے مسز برین سن کے نام ایلس کا لکھا ہوا خط بھی دیکھا ہے اور بتا رہی تھیں کہ بڑا زبردست خط تھا۔ ان کا خیال ہے کہ کاش مسز برین سن سے اس معاملے پر بات نہ ہوئی ہوتی تو معاملہ اور سہل ہو جاتا۔

میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اپنے ذہن سے تمام خدشات ختم کر دینے چاہئیں۔ جب ایلس نے تمام لوگوں کے سامنے یہ موقف اختیار کر لیا ہے تو اس سے روگردانی ممکن نہ ہوگی۔ مجھے لگتا ہے کہ

اب آہستہ آہستہ وہ مجھ سے دور ہوتی چلی جائے گی۔ وہ ایسا کرنا پسند کرے گی، اور یوں اس کا انتقامی رویہ بھی ختم ہو جائے گا۔

جانِ من، میں کل تک زندہ رہوں گا، کیونکہ مجھے ایک تار کا انتظار ہے جواب تک نہیں آیا۔
میں تمہاری بانہوں اور بوسوں کے لئے بے قرار ہوں......

میری جانِ تمنا آٹولن!

تمہارا محبوب

'بی'

---

25 جولائی، 1911ء

میری جان!

یہ اچھا ہوا کہ دوپہر کو تمہارا خط مل گیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے پیار کو مرنے نہیں دو گی۔ لیکن یہ جان لو کہ محبت کی پرورش نہ کی جائے تو یہ بالآخر دم توڑ دیتی ہے۔ اگر تم نے ساتھ نہ دیا تو ہماری محبت بھی مر سکتی ہے۔ پتہ نہیں مجھے یہ سب کہنا بھی چاہئے یا نہیں، لیکن مجھے اتنا پتہ ہے کہ میں غلط نہیں ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر تم سب کر رد کر دو تو گو کہ مجھے تمہارا یہ فیصلہ قبول کرنا ہوگا، لیکن یہ درست نہ ہوگا۔ اس سے میں کس قدر حقیر ہو جاؤں گا، اور یہ عمل ہمارے پیار کو بے وقار کر دے گا۔ میں چاہوں گا کہ تم اس خط کا فوری جواب لکھو۔ میرے جذبات اور احساسات سے تم بخوبی واقف ہو۔

تم سے الگ ہونے کے چند گھنٹوں تک میرا یقین تھا کہ تم میری خواہش کے مطابق فیصلہ کرو گی۔ لیکن اب مجھے ایسا نہیں لگتا۔ میں اس قدر تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں کہ پریشانی کے سوا اور کسی جذبے کا احساس باقی نہیں رہا۔ تم مستحکم قوتِ ارادی کی مالک ہو اور اس کے خلاف کھڑا ہونا بہت مشکل ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میں حوصلے کی کمی نہیں بلکہ تمہارا حوصلہ قابلِ ستائش ہے۔ مگر ایک حوصلہ وہ بھی ہے جو ایک فرد کو مسرت کے لمحات سے اپنا حصہ وصول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ مجھ سے متعلق ایسی بہت سی باتیں ہیں جو میں

تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔لیکن اب میں خودکو اتنا آزاد محسوس نہیں کرتا۔لیکن انہی باتوں سے تمہیں اندازہ ہو گا کہ جس چیز کو میں صحیح سمجھتا ہوں، اس سے متعلق اتنا پُر مسرت کیونکر ہوتا ہوں۔اور ہاں، اے جانِ تمنا! میں تمہارے بےغرض ایثار کو بہت اہمیت دیتا ہوں، کیونکہ میں اسے درست سمجھتا ہوں۔

گو کہ اب مجھ پر نیند کا غلبہ ہے لیکن میں خود کو خط لکھنے سے روک نہیں پا رہا۔یہاں کا ماحول نہایت ہیبت ناک ہو چکا ہے۔بے چاری ایلس مجھ پر یوں سوار ہو چکی ہے کہ میں سوچتا ہوں کہ اسے مزید ایک لمحے کے لئے بھی کیسے برداشت کروں۔میں اپنی غیر حاضری کے بعد اکثر اسے تھکا ہوا پاتا ہوں، لیکن اس بار یہ بالخصوص بہت برا ہے۔اس کے باوجود میں مسلسل اس کے سامنے باتیں کرتا اور مسکرا تا رہا ہوں۔شاید اس لئے محض ظاہری طور پر شخصیت کو دیکھنے والے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اس دنیا میں کوئی پریشانی یا مشکل نہیں۔

کیرن اور، رے دونوں یہیں پہ ہیں۔رے مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ہے۔مجھے لگتا ہے کہ وہ ایلس کی طرح کرخت مزاج، غیر محنتی اور نا مخلص ہے۔کیرن اس سے بالکل مختلف ہے۔مجھے حالیہ تعطیلات میں اسے پڑھانا ہے۔اسی دوران مجھے فلسفے پر ایک عام فہم کتاب بھی مکمل کرنی ہے۔اس پر لکھنے کا آغاز میں نے ابھی نہیں کیا۔خدا جانے یہ سب کیسے ہوگا۔لیکن مجھے یہ سب ضرور کرنا ہوگا کیونکہ میں اس کا معاہدہ کر چکا ہوں۔

جانم! مجھے ابھی بھی لگتا ہے کہ تم میرے خیال کے مطابق فیصلہ کرو گی۔میری تھکاوٹ اگر کم ہوتی تو شاید میں زیادہ پرامید ہوتا۔لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ زندگی ایک طویل طنزیہ تمثیل ہے، جس میں اچھی چیزیں صرف اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں اور معمول کی زندگی کو مزید دشوار بنا جاتی ہیں۔میں ابدی حیات کا خواہش مند نہیں، کیونکہ آرام تو صرف قبر میں ہے۔

الوداع، الوداع!

'بی'

ٹرین میں

28 جولائی، 1911ء

میری بہت ہی پیاری!

تمہارا خط دل موہ لینے والا ہے۔ تمہاری تکلیف کا زیادہ ذمہ دار میں ہوں۔ یہ میرے ضابطہ اخلاق کے خلاف ہے کہ میں ارادوں میں ٹکراؤ پیدا کروں۔ مجھے ہوش سے کام لینا چاہئے، مگر میں کیا کروں کہ یہ سب میرے بس میں نہیں۔ تم نے مجھے جس صورتِ حال کو قبول کرنے کو کہا ہے وہ بہت مشکل ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ سب میرے لئے کس قدر دشوار ہے۔ میں جس صورتِ حال میں ہوں، وہ میرے لئے بے حد انوکھی ہے۔ اسے سمجھنے میں مجھے وقت لگے گا۔

تم نے فلپ کو سب کچھ بتا دیا ہے، اور اب میرے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس کے باوجود تم اس کے ساتھ سونے کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہو۔ اگر یہ میری سمجھ میں آجائے تو شاید معاملہ کچھ آسان ہو جائے۔ جیسے میں اگر اب بھی ایلس کے ساتھ سوتا رہوں تو کیا یہ تمہارے لئے قابلِ قبول ہوگا؟ سوچنا یہ ہے کہ کیا میں یہ سب برداشت کرلوں، اور یہ فرض کرلوں کہ کیوں کہ یہ میری محبوبہ کو پسند ہے۔ دیکھو، میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے کمرے میں نہ رہے۔ یا مجھے یہ سمجھاؤ کہ آخر اس کا ایک ہی کمرے میں رہنا کیوں ضروری ہے؟!

تم ہرگز یہ مت سوچنا کہ میں اچانک رشتہ توڑ دوں گا یا تشدد پہ اتر آؤں گا۔ گو کہ جب میں تمہارے ساتھ ہوتا ہوں تو اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہوں، اور کوئی بھی انہونی مجھ سے سرزد ہو سکتی ہے۔ پھر بھی تم خاطر جمع رکھو کہ میں کوئی حماقت نہیں کروں گا۔ لیکن تمہی بتاؤ کیا کسی گندگی کو دیکھ کر مجھے اسے نظرانداز کر دینا چاہئے؟! میں خود کو ایسے برے کام سے باز نہیں رکھ پاتا جو مجھ میں اس قدر احساسِ ندامت پیدا کر دیں کہ میں اقدامِ خودکشی تک پہنچ جاؤں۔ ہاں لیکن تمہارے اور اپنے بیچ میں کسی قسم کی ندامت کو نہیں آنے دوں گا۔

یہ سب سمجھنے کے بعد میں تمہارے ساتھ محبت کے لئے لازمی ذہنی قربت محسوس نہیں کرتا،اس لئے مجھے خود سے گھن سی آتی ہے۔یہ بہت مشکل ہے۔میں جانتا ہوں میں غلطی پر ہوں۔مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے لئے کیا اعلیٰ اور کیا درست ہے!

'بی'

سعیِ ناتمام..........جرمن دوشیزہ

1913ء کے آخری ایام میں، میں اوٹولن سے ملنے روم گیا، مگر فلپ بھی وہیں تھا، اس لئے میرا سفر اکارت گیا۔ البتہ اس دوران میں نے وہاں ایک جرمن خاتون کو دوست بنایا جس سے میری ملاقات گذشتہ گرمیوں میں گاردا کی جھیل پر ہوئی تھی۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ میں اور سانگر کوہِ الپس کے علاقے میں مٹر گشت کر رہے تھے۔ وہاں ہم نے ایک نوجوان خاتون کو میز پر اکیلے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ہم یہ بحث کرنے لگے کہ وہ شادی شدہ ہے یا نہیں۔ میرا کہنا تھا کہ یہ طلاق یافتہ ہے۔ یہ جاننے کے لئے بالآخر میں نے آگے بڑھ کر اس سے بات چیت کا آغاز کیا۔ اس سے گفتگو کر کے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ بالکل سہی تھا۔ اس کا شوہر ماہر نفسیات تھا۔ پیشہ ورانہ مجبوریوں کے باعث وہ بیوی سے اکثر دُور رہتا، اس لئے خاتون نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ سو، میری جب اس ملاقات ہوئی تو ان کے درمیان طلاق ہو چکی تھی۔ البتہ بعد ازاں انہوں نے دوبارہ شادی کر لی اور ایک خوش وخرم ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔

وہ ایک پُرکشش نوجوان خاتون تھی۔ اس کے دو چھوٹے بچے تھے۔ اُن دنوں مجھے بچوں کی شدید آرزو نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ میں گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر ناقابلِ بیان درد کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا۔ بہرحال، میری اسؔ خاتون کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ ہم دونوں دیہی علاقوں کی سیر کو نکل گئے۔ میں اس سے جنسی تعلق قائم کرنا چاہتا تھا، مگر یہ چاہتا تھا کہ پہلے اسے اوٹولن سے متعلق سب کچھ بتا دوں۔ اوٹولن کے ذکر سے قبل وہ مائل بہ کرم تھی، لیکن اس کے بعد اس کا رویہ بدل گیا۔ البتہ اس نے یہ طے کیا کہ ایک مخصوص دن کے لئے اصولوں میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد میری اس خاتون سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ چند برسوں تک اس کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ رہا۔

ہزاروں خواہشیں..........امریکی حسینہ

ہاورڈ یونیورسٹی میں (میرے پڑھانے کی) ٹرم پوری ہوئی تو میں نے چند دیگر یونیورسٹیوں میں ایک ایک لیکچر دیا۔ اس سلسلے میں این آر باور بھی جانا ہوا۔ وہاں کے صدر نے مجھے تمام نئی عمارتیں دکھائیں۔ بالخصوص وہ مجھے وہاں کی لائبریری لے گیا، جس پر اسے بہت فخر تھا۔ اس کے بقول اس لائبریری کا کارڈ انڈیکس دنیا میں سب سے زیادہ سائنٹفک تھا اور لائبریری کی عمارت کو گرم رکھنے کا طریقہ غیر معمولی طور پر جدید ترین تھا۔ صدر جب مجھے یہ سب بتا رہا تھا تو ہم ایک بڑے سے ہال نما کمرے کے بیچ میں شاندار ڈیسکوں کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے پوچھا، ''ذرا یہ بتائیں کہ یہ کتابیں کوئی پڑھتا بھی ہے؟'' اسے اس سوال پر حیرت ہوئی، پھر ایک دم اس نے کہا، ''ہاں ہاں، بالکل، کیوں نہیں، وہ دیکھئے اس وقت بھی ایک آدمی پڑھ رہا ہے۔'' ہم اس شخص کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ ایک ناول پڑھ رہا تھا۔

این آر باور سے میں شکاگو چلا گیا۔ جہاں میں ایک معروف گائنا کالوجسٹ کے خاندان کے ساتھ رہا۔ اس نے خواتین کے امراض پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، جس کے ٹائٹل پر بچہ دانی کی ایک رنگین تصویر شائع کی گئی تھی۔ اس نے مجھے وہ کتاب دی، لیکن میں اس میں الجھ کر رہ گیا، اس لئے بعد میں میں نے وہ ایک ڈاکٹر دوست کو دے دی۔ وہ گائنا کالوجسٹ مذہبی طور پر آزاد خیال لیکن اخلاقی طور پر کٹر قدامت پرست تھا۔ مجھے لگا کہ وہ منہ زور جنسی جذبات کا مالک ہے، اور ضبطِ نفس کی کوششوں کے اثرات اس کے چہرے پر بھی نظر آتے تھے۔ اس کی بیوی ایک دل موہ لینے والی عمر رسیدہ خاتون تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی حد تک وہ ہشیار بھی تھی۔ ان کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا پہلی عالمی جنگ کے دنوں میں فوت ہو چکا تھا۔ میری اس سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔ جن دنوں میں باگلے وڈ میں مقیم تھا، اس خاندان کی ایک لڑکی گلبرٹ مرے کی زیر نگرانی یونانی ادب پر کام کرنے

کے لئے آکسفورڈ آئی تھی۔ یہ لڑکی بریان ماور کی اپنی انگریزی ادب کی ٹیچر سے ایلس اور میرے نام ایک تعارفی چٹھی بھی لائی تھی۔ آکسفورڈ میں، میں نے چند بار اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ مجھے اچھی لگی۔ میں نے اسے مزید جاننے کی خواہش کی۔ جب میں شکاگو جا رہا تھا تو اس نے مجھے خط لکھ کر اپنے والدین کے ہاں قیام کی دعوت دی۔ یہ دعوت میں نے قبول کر لی۔

میں جب شکاگو پہنچا تو وہ خود مجھے اسٹیشن تک لینے آئی۔ اس سے ملتے ہی مجھے اس قدر بے تکلفی کا احساس ہوا کہ جتنا امریکہ میں اور کسی سے مل کر نہ ہوا۔ بعدازاں مجھے پتہ چلا کہ وہ اچھی خاصی شاعری لکھتی ہے، اور ادب سے متعلق اس کے خیالات زبردست اور غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ میں اس کے ہاں دو راتیں رہا، اور دوسری رات میں نے اس کے ساتھ گزاری۔ اس کی تینوں بہنیں باہر پہرہ داری کرتی رہیں کہ مبادا ماں باپ میں سے کوئی ادھر آ نکلے تو خبردار کر سکیں۔ وہ روایتی معنوں میں خوبصورت نہ سہی لیکن نہایت مسرت انگیز تھی۔ اس کا انداز شاعرانہ اور جوشیلا تھا۔ اور اس کا شباب تنہائی اور پھیکے پن کا شکار تھا۔ مجھے لگتا کہ میں اس کی ناآسودہ آرزوؤں کی تکمیل کر سکتا ہوں۔ اس رات ہم نے طے کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، وہ انگلستان آئے گی اور ہم دونوں مل کر کھلے عام رہنے لگیں گے۔ بعد میں کبھی طلاق ہوئی تو ہم شادی بھی کر لیں گے۔

اس کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔ رستے میں، میں نے اوٹولن کو خط لکھا اور یہ سارا معاملہ بتایا۔ اس کا جواب تھا کہ آئندہ یہ معاملہ صرف رومانوی حد تک رہنا چاہئے۔ بہرکیف، امریکہ میں میرے پائیوریا کے مرض کا علاج ہو چکا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی اور بعض دوسری وجوہات کے باعث بھی اوٹولن نے علیحدگی کا ارادہ بدل دیا تھا۔ اب بھی، وہ جب چاہتی ایسی محبوبہ بن جاتی جسے چھوڑنا محال لگتا۔ تاہم کافی عرصے سے وہ مجھ سے کھچی کھچی سی رہنے لگی تھی، کچھ زیادہ کھلتی نہ تھی۔

میں جون میں انگلستان پہنچا اور لندن میں اوٹولن سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے ہر منگل کو پورے ایک دن کے لئے برنہم کے ساحل پر جانا شروع کر دیا۔ جس روز ہم آخری بار وہاں گئے، اس

روز آسٹریا نے سربیا کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا۔ اس روز اوٹولن کا شباب جوبن پر تھا۔

دوسری طرف شکاگو والی لڑکی نے ہمارے بیچ تعلق سے بے خبر باپ کو یورپ آنے پر آمادہ کر لیا۔ 13 اگست کو وہ سمندری سفر کے ذریعے روانہ ہوئے۔ جب وہ پہنچی تو میرے اعصاب پہ بس جنگ ہی جنگ سوار تھی۔ میں نے واشگاف طور پر جنگ کی مخالفت کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس لئے میں کسی نجی سکینڈل سے خود کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس صورت میں ظاہر ہے میری باتیں بے اثر ہو جاتیں اور کوئی میری باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیتا۔ اس لئے اب ان حالات میں اس لڑکی سے کئے ہوئے عہد و پیمان کی تکمیل کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ لندن میں مقیم رہی اور وقتاً فوقتاً میرا اس سے تعلق بھی قائم رہا۔ لیکن جنگ نے اس کے لئے میرے جذبات کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ بادل نخواستہ مجھے جان بوجھ کر اس کا دل توڑنا پڑا۔ آخر کار وہ ایک ایسے مرض کا شکار ہو گئی جس نے پہلے تو اسے مفلوج کر دیا اور پھر اسے ذہنی توازن سے محروم کر دیا۔ اسی دوران جنوں کے عالم میں اس نے اپنے باپ کو سارا قصہ سنا دیا۔

میں نے اسے آخری بار 1924ء میں دیکھا۔ تب وہ چلنے پھرنے سے لاچار ہو چکی تھی۔ تاہم ان دنوں کی طبیعت قدرے بہتر تھا۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ تاریک اور جنوں آمیز خیالات کے حصار میں ہے۔ اس کے بعد شاید اس کی طبیعت پھر کبھی نہ سنبھل سکی۔

جنوں کے حملے سے قبل وہ ایک زبردست اور شاندار ذہن کی مالک تھی۔ اس کی شخصیت جس قدر محبت کے قابل تھی، اتنی ہی غیر معمولی بھی تھی۔ جنگ کا عذاب نازل نہ ہوتا تو شاید ہم شکاگو میں بنائے ہوئے منصوبے پر عمل کرتے اور ہماری جھولی خوشیوں سے بھر جاتی۔

اس المیے کا مجھے آج بھی دکھ ہے!

حسنِ بلاخیز..........کولٹی

کلفر ڈایلین کے پولیس کورٹ کیس کے دوران لیڈی کونسٹن میلسن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے اسٹیج کے نام کولٹی اونیل سے زیادہ معروف تھی۔ اس کی والدہ لیڈی الینسلے کی پروشیا کے پرنس ہنری سے رسم وراہ تھی۔ یہ تعلق جنگ سے پہلے قائم ہوا اور جنگ کے بعد باقاعدہ استوار ہوا۔ اس تعلق کے باعث جنگ کے حوالے سے وہ غیر جانبدار رجحان کی حامل ہوگئیں۔ جبکہ کولٹی اور اس کی ہمشیرہ لیڈی کلارے تہہ دم سے امن کی حامی تھیں۔ انہوں نے (جنگ کے لئے) جبری بھرتی کے خلاف بننے والی تنظیم کے ساتھ مل کر کام بھی کیا۔ کولٹی کی شادی اسٹیج کے اداکار اور ڈرامہ نویس مائلز میلسن سے ہوئی تھی۔ 1914ء میں اسے جنگ کے لئے جبری طور پر بھرتی کرلیا گیا لیکن اتفاق سے ایک پاؤں میں پائی جانے والی معمولی خامی کے باعث اسے واپس کر دیا گیا۔ یوں اسے ایک مفید مقام حاصل ہوگیا، جسے اس نے جبری بھرتی کے بااصول مخالفین کے حق میں خوب استعمال کیا۔

کولٹی کو میں پولیس کورٹ میں دیکھا۔ وہیں ہمارا تعارف ہوا۔ پتہ چلا کہ وہ ایلین کی جاننے والی تھی۔ وقت کے معاملے میں نہایت فراخدل، مذہبی طور پر آزاد خیال، اور تہہ دل سے ایک امن پرست تھی۔ یہ تو میں خود بھی خیر دیکھ چکا تھا کہ وہ جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری و باطنی حسن سے مالا مال تھی۔ وہ اسٹیج پر کام کرتی تھی، اور یکے بعد دیگرے دو کامیاب کردار ادا کر کے نہایت سرعت سے شہرت کے زینے چڑھ چکی تھی۔ لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ نوکونسکر پشن فیلو شپ کے دفتر میں دن بھر لفافوں پر پتے درج کرنے کا کام لگی۔ یہ وہ تمام عوامل تھے جنہوں نے مجھے کولٹی کی جانب متوجہ کیا اور میں مجھے اس سے متعلق مزید جاننے کی خواہش ہوئی۔

یہ بتاتا چلوں کی اس دوران اوٹولن کے ساتھ میرے تعلقات میں پہلی سی گرم جوشی نہ رہی تھی۔ 1905ء میں وہ لندن چھوڑ کر آکسفورڈ کے قریب گیرسنگٹن کے مقام پر مینور ہاؤس میں رہنے

تھی۔ یہ ایک دیدہ زیب پرانے طرز کی رہائش گاہ تھی، جو فارم ہاؤس کے بطور زیر استعمال رہی تھی۔ اوٹولن وہاں صلاحیتوں کو جلا دینے میں مصروف رہی۔ میں اکثر وہاں جاتا، لیکن میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ اس کی بے اعتنائی میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ اس لئے ذہنی تناؤ اور الجھن سے نپٹنے کے لئے میں نے دوسری عورتوں میں دلچسپی لینی شروع کردی۔

کولٹی کے ساتھ ابتدائی ملاقات میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو پائی۔ پولیس کورٹ کی کاروائی کے بعد میری اس سے دوسری ملاقات امن پرستوں کے ایک حلقے کی جانب سے دیے گئے ایک عشائیے میں ہوئی۔ ریسٹورنٹ سے میں دیگر افراد کے ہمراہ کولٹی کے ساتھ چل کر 43 برنارڈ اسٹریٹ پہ واقع اس کی رہائش گاہ تک آیا۔ میرے جذبات بے قابو ہو رہے تھے، تاہم میں اسے محض یہ اطلاع دینے کے سوا کچھ نہ کر پایا کہ چند روز بعد بیکر اسٹریٹ کے پورٹ مین رومز میں میرا ایک خطبہ ہوگا۔

کولٹی عین وقت پر آ گئی۔ میں نے اسے آگے کی، سامنے والی ایک نشست پہ بیٹھتے دیکھا۔ سو تقریب کے بعد میں نے اسے ایک ریسٹورنٹ میں شام کی چائے کی دعوت دے دی، اور پھر اس رہائش گاہ تک پیدل اس کے ساتھ گیا۔ پچھلی بار میں دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا تھا، اس بار اس کے اصرار پر گھر کے اندر داخل ہوا۔ اس کا جوبن غضب ڈھا رہا تھا۔ تاہم میں نے جان لیا کہ اوٹولن کی طرح وہ بھی اس معاملے میں مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ (حوصلہ مندی ایسی صفت ہے جسے میں اپنی ہر محبوب عورت میں دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہوں) نصف شب تلک ہم محوِ گفتگو رہے، اور اسی گپ شپ میں ایک دوسرے کے مداح ہو گئے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے معاملات میں آدمی کو محتاط اور دور اندیش ہونا چاہئے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس رات جب ہم ملے، تو ایک دوسرے سے کم ہی آشنا تھے، اس کے باوجود ہمارے بیچ ایک ایسا تعلق قائم ہو گیا جو نہایت سنجیدگی اور اہمیت کا حامل تھا۔ آنے والے دنوں میں اس تعلق نے ہمیں کئی مسرتیں بھی بخشیں تو ساتھ ہی کچھ رنج و غم بھی دیے۔ لیکن یہ تعلق کبھی بھی نہ تو سطحی پن کا شکار ہوا نہ کبھی غیر اہم ہوا۔

پہلی عالمی جنگ اس رشتے کی نسبت میں شروع سے آخر تک شامل رہی۔ جب ہم پہلی بار ہم بستر ہوئے (یہاں میں یہ واضح کر دوں جس رات ہم نے واقفیت سے محبت تک کا سفر طے کیا، اس رات ہمارے درمیان جنسی تعلق قائم نہیں ہوا تھا کیونکہ کہنے اور سننے کو تب ہمارے پاس بہت کچھ تھا) تو اچانک گلی میں فتح کے وحشت انگیز نعرے بلند ہوئے۔ میں بستر سے نکل کر باہر گیا تو دیکھا کہ ایک سفری غبارہ شعلوں کی نذر ہو رہا تھا۔ گویا یہ نعرے بہادر انسانوں کو اذیت ناک موت کی نذر ہوتے دیکھ کر بلند کیے جا رہے تھے۔ اُس لمحے کولٹی کی آغوش میری جائے پناہ تھی۔ اس نے مجھے محض ظلم و بربریت سے تحفظ ہی نہ دیا بلکہ انسانوں کے اذیت ناک رویوں کی تکلیف سے بھی بچایا۔

مجھے ایک اتوار یاد ہے جو ہم نے ساؤتھ ڈاؤنز میں مٹر گشت کرتے گذاری۔ شام ڈھلے ہم لندن واپسی کی ٹرین پکڑنے کے لئے لیوس اسٹیشن پہنچے۔ وہاں فوجیوں کا جم غفیر تھا۔ ان کی اکثریت محاذ پہ واپس لوٹ رہی تھی۔ تقریباً سبھی نشے میں دھت تھے۔ نصف سے زائد فوجیوں کے ساتھ مدہوش طوائفیں تھیں اور باقیوں کے ساتھ ان کی محبوبائیں یا بیویاں تھیں۔ وہ بھی بدحال، بے پرواہ اور وحشت ناک دکھائی پڑتے تھے۔ اس منظر نے جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کا احساس میرے دل پہ ثبت کر دیا۔ میں تمام راہ کولٹی سے چمٹا رہا۔ اس نفرت انگیز دنیا میں وہ محبت کا جزیرہ تھی۔ علاوہ ازیں وہ نہایت مستحکم حوصلے کی مالک تھی، جو اُن دنوں ایک نایاب شے تھی۔

سفری غبارہ گرنے والے واقعے کی رات کے بعد، صبح سویرے میں کولٹی سے جدا ہو کر گورزن سکوائر میں اپنے بھائی کے گھر آ گیا۔ جہاں میں رہائش پزیر تھا۔ رستے میں مجھے پھول بیچنے والا ایک عمر رسیدہ آدمی ملا۔ وہ 'تازہ خوبصورت گلاب' کی آوازیں لگا رہا تھا۔ میں نے اسے ایک گلدستے کی رقم دی اور کہا کہ وہ یہ گلدستہ برنارڈ اسٹریٹ پہنچا دے۔ شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ کیا پتہ بوڑھے نے پیسے لے کر پھول نہ پہنچائے ہوں، لیکن میرے ذہن میں ایسا کوئی اندیشہ نہیں آیا۔ بلکہ تب سے کولٹی سے متعلق میرے تمام خیالات 'تازہ خوبصورت گلاب' کے الفاظ کی صورت ٹیپ کا مصرعہ بن گئے۔

بعدازاں ہنی مون منانے کے لئے ہم تین دن کے لئے ہکسٹن سے اوپر دہسان میں کیت اینڈ فیڈل نامی مقام چلے گئے۔وہاں زبردست سردی تھی۔صبح کے وقت جگ میں سارا پانی برف بن گیا۔بہرکیف، یہ سنسنان مقام ہمارے جذبات سے لگا کھاتا تھا اور ہمیں مکمل آزادی کا احساس دلاتا تھا۔ہم وہاں دن بھر گھومتے رہتے۔وہاں ہماری راتیں ایک جذبے کی حالت میں بسر ہوئیں جو دنیا بھر کی تکالیف کی شدت کو ختم تو نہیں کرسکتا لیکن اس کے وجد سے البتہ ایک ایسی کیفیت جنم لیتی ہے جو ماورائی سی لگتی ہے۔

ایک عرصے تک میں کولٹی سے تعلق کی شدت کا اندازہ ہی نہ کرسکا۔میں تو گویا طے کرچکا تھا کہ میرے جذبات کی شدت صرف اوٹولن ہی سے منسوب ہے۔کولٹی اس کی نسبت زیادہ جوان، معصوم اور بھرپور تھی۔مجھے اپنے جذبوں پہ اعتبار ہی نہ رہا، میں اسے بس معمول کا تعلق سمجھتا رہا۔کرسمس کے دنوں میں میرا گیرسنگٹن جانا ہوا، جہاں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام تھا۔کینز نے وہاں دو کتوں کی شادی کی رسم ادا کی۔لٹن اسٹریچی نے 'معروف وکٹوریائی شخصیات' کے مسودے سے کچھ حصہ ہمیں سنایا۔ان کے علاوہ کیتھرائن منسفیلڈ اور مڈلٹن مرے کو بھی دعوت دی گئی تھی۔مجھے اس پارٹی کے توسط سے کیتھرائن کو زیادہ جاننے کا موقع ملا۔پتہ نہیں اس سے متعلق میرا یہ تاثر کتنا درست ہوگا کہ وہ اس کے متعلق پائی جانے والی عمومی رائے سے خاصی مختلف ہے۔وہ زبردست نطق کی مالک تھی۔میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کی گفتگو، اس کی تحریر سے کہیں زیادہ شاندار ہے۔البتہ بعض نوجوانوں کے ذکر پہ اس کی باتوں پہ حسد اور تعصب کا شائبہ ہوتا تھا۔اوٹولن سے بالخصوص اسے رقابت تھی۔اس کی وجہ مرے کا اسے پسند کرنا تھا۔

انہی دنوں میں طے کرلیا کہ اوٹولن سے متعلق مجھے اپنے جذبات پہ قابو پانا ہوگا۔اس کی محبت میں پہلی سی گرم جوشی مفقود تھی اور وہ میرے لئے اب مسرت انگیز نہ رہی تھی۔اوٹولن کے خلاف کیتھرائن کی ساری باتیں میں نے سنیں۔میں اس کی تمام باتوں سے اتفاق تو نہیں کرتا تھا لیکن اس کے نتیجے میں، میں یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوا کہ اوٹولن ایک محبوبہ نہیں، محض ایک دوست ہے۔اس کے بعد کیتھرائن سے تو میری کبھی ملاقات نہ ہو پائی، لیکن اوٹولن سے متعلق میری رائے ضرور بدل گئی۔

برطانیہ واپس آنے کے بعد میں نے دورہِ روس کے دوران اپنے بدلتے ہوئے خیالات کو کولیٹی کے نام (سابقہ تاریخوں کے اندراج کے مطابق) خطوط کی صورت میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ یہ خطوط میری ذہنی کیفیات کی عمدہ ترجمانی کرتے ہیں۔ اب میں شاید ان سے بہتر انداز میں اظہارِ خیال نہ کرسکوں۔ اس لئے کچھ ان میں سے کچھ خطوط یہاں نقل کرتا ہوں۔

لندن

24 اپریل 1920ء

روانگی کا دن قریب آرہا ہے۔ مگر میں یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔ بے کار خیالوں میں گم ہوں۔ ایسے بے کار اور باغیانہ خیالات کسی منظم شخص کے ذہن میں نہیں سما سکتے۔ مصروفیت اس قسم کے خیالات کو خودبخود کچل دیتی ہے، مگر یہاں تو یہ صورت ہے کہ یہ خود کام کو ختم کئے جارہے ہیں۔ مجھے واقعی ان لوگوں پہ رشک آتا ہے جو ہمیشہ اپنے اعتقادات سے جڑے رہتے ہیں۔ میں دنیا کے لئے مفید ہونے، کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام دینے اور دنیا کو نئی امید دینے کا متمنی تھا۔ اب جبکہ یہ سب کرنے کا موقع مل رہا ہے تو مجھے یہ سب بے کار اور فضول معلوم ہونے لگا ہے۔ مستقبل میں جھانکتا ہوں تو میری کھلی آنکھوں کو صرف کشیدگی، انتشار، ظلم وستم اور غلامانہ اطاعت کو ہی نظر آتی ہے۔ کیا اس دنیا میں میرے خوابوں کے جیسے نڈر اور بے باک انسان بھی جنم لیں گے؟ یا انسان ہمیشہ یونہی لڑتے بھڑتے رہیں گے، ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہیں گے، یہاں تک کہ دھرتی سرد ہوجائے گی اور دم توڑتا سورج ان کے بے مقصد جنون کو مزید توانائی دینے سے محروم ہوجائے گا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر اس دکھ اور مایوسی سے ضرور آگاہ ہوں جو میری روح میں پیوست ہے۔ ہلا دینے والی گہری تنہائی سے میں واقف ہوں۔ بھوت کی مانند بھٹکتا پھرتا

ہوں۔ اَن سنی آوازوں میں بولتا ہوں۔ لگتا ہے کہ میں کسی اور ہی سیارے سے یہاں آ گرا ہوں۔

چھوٹی خوشیوں اور بڑے غم کے مابین قدیم کشمکش جاری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ چھوٹی خوشیاں موت ہیں مگر میں کیا کروں کہ میں درماندہ ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ میرے اندر عقل اور جذبات کی خونی لڑائی چل رہی ہے۔ یہ جنگ بیرونی عمل کے لئے میری ساری توانائیاں ضبط کر لیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مقابلے کے بنا، بے دردی، تنظیم اور نظم وضبط کے بنا کسی کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ اجتماعی فلاح کے لئے فرد کو مشین میں بدلنا ضروری ہے۔ میری عقل مجھے ان تمام باتوں پر یقین کرنے پر تو مجبور کر سکتی ہے لیکن مجھے ان سے کوئی تخلیقی تحریک نہیں ملتی۔ میں انفرادی انسانی روح کا عاشق ہوں، اس کی تنہائی سے، اس کی امیدوں اور خوف سے، اس کی ہنگامی تحریکوں اور فوری وابستگیوں سے مجھے لگاؤ ہے۔ اس سے افواج، ریاستوں اور افسروں تک کا سفر بہت طویل ہے، مگر یہ طویل سفر طے کر کے ہم بے فائدہ جذبات پرستی سے چھٹکارہ حاصل کر سکتے ہیں۔

جنگ کے تمام بے کیف اور تکلیف دہ ایام کے دوران، میں اس کے خاتمے پر ایک روشن دن کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ جب ہم تم بحیرہ روم کے کنارے پھولوں کی خوشبو سے لدے ہوئے روشن باغ میں بیٹھیں گے اور بالآخر وہاں میں اپنی محبت کا اعتراف کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔ اور اس خوشی کو چھو سکوں گا جو دکھ جتنی حقیقی ہوتی ہے۔ شاید وہ وقت آ گیا ہے.......... مگر مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں، اور تمہاری بھی اور بہت سی خواہشیں ہیں......

پھر بھی یہاں بیٹھ کر سوچتا ہوں تو سارے کام بے فائدہ اور ساری خواہشیں احمقانہ لگتی ہیں۔ مگر میں ان خیالات پر عمل نہیں کروں گا!

پیٹروگراڈ

12 مئی 1920ء

بالآخر میں اس شہر کو پہنچ چکا ہوں، جس نے دنیا کو ایک نئی تاریخ دی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس

نے شدید ترین نفرتیں اور ہیجان انگیز امیدیں عطا کی ہیں۔ کیا یہ شہر مجھے اپنے اسرار میں شریک کرے گا؟ یا پھر میرے حصے میں صرف اعداد و شمار اور سرکاری حقائق ہی آئیں گے؟ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، میں اس کا مشاہدہ کر پاؤں گا یا یہ سب میرے لئے محض انتشار زدہ منظر ہی رہے گا؟!

نیم شب کے قریب ہم سنسان اسٹیشن پہنچے۔ ہماری شور انگیز موٹریں گلیوں میں ادھم مچانے لگیں۔ وہاں پہنچ کر میں اپنی کھڑکی سے دریائے نیوا کے پار پیٹر اور پال کے قلعے کا نظارہ کرتا رہا۔ شمالی صبح کی کرنوں سے یہ دریا دمک رہا تھا۔ یہ ایک ناقابلِ بیان نظارہ تھا۔ اس میں ایک قسم کے جادو اور قدیم دانش کے اشارے پوشیدہ تھے۔ میں نے اپنے قریب کھڑے ایک بالشویک سے کہا، ''یہ نہایت خوب ہے۔'' اس کا جواب تھا، ''آپ سچ کہہ رہے ہیں، اب یہ قلعہ جیل خانہ نہیں رہا، یہ اب فوج کا ہیڈکوارٹر ہے۔''

مجھے ایک دم جھٹکا سا لگا۔ ''اے میرے دوست......'' میں نے خود سے کہا، ''تم یہاں سیر سپاٹے کے لئے نہیں آئے ہو کہ طلوعِ خورشید کے مناظر اور عمارتوں کو دیکھ کر جذبات کے جام لنڈھانے لگو۔ تم یہاں ایک سماجی محقق کے طور آئے ہو۔ تمہارا فریضہ معاشی و سیاسی حقائق کا مطالعہ کرنا ہے۔ خوابوں کی دنیا سے باہر نکلو۔ قدرتی چیزوں کو بھول جاؤ۔ ورنہ جن لوگوں کے ساتھ تم آئے ہو، یہ تمہیں یاد دلائیں گے کہ یہ سب مراعات یافتہ بورژوا لوگوں کی ذہنی عیاشی ہے، اور کیا واقعی ایسا نہیں ہے؟!''............ اس خیال کے ساتھ ہی میں دوبارہ اُن کی گفتگو میں شامل ہو گیا تاکہ سوویت دکانوں سے چھتری خریدنے کا طریقہ کار سیکھ سکوں۔

.... میں سوویت سرزمین پر بارہ گھنٹے گزار چکا ہوں۔ اور اس عرصے میں، میں کچھ قابلِ ذکر چیز نہیں دیکھ پایا۔ میں اس دوران یہاں جسمانی مشقت، بے آرامی، دھول مٹی اور فاقہ کشی کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ یہ سب کچھ میں بنی نوع انسان کے لئے ایک عظیم الشان امید کے ماحول کی آس پر برداشت کرنے کو تیار تھا۔ ہمارے اشتراکی ساتھیوں نے بلاشبہ جائز طور پر ہمیں اس سلوک کے قابل نہ سمجھا۔ کل دوپہر کو سرحد پار کرنے سے لے کر اب

تک دو عالیشان ضیافتیں، ایک عمدہ ناشتہ، اعلیٰ درجے کے بہت سے سگار اور شاہی لوازمات سے مزین ایک پُرتعیش خواب گاہ میں رات گزارنے کا موقع میرے حصے میں آچکا ہے۔ راستے میں آنے والے اسٹیشنوں پر سرخ سپاہیوں کے دستے پلیٹ فارم پہ قابو پائے ہوئے تھے تاکہ عام لوگوں کو ہماری نظروں سے دور رکھا جاسکے۔ لگتا ہے کہ میں کسی عظیم فوجی سلطنت کی حکومت کے طمطراق اور شان وشوکت کے ماحول میں آگیا ہوں۔ لہٰذا مجھے خود کو اس صورت حال سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ اس وقت قنوطیت کی شدید ضرورت ہے۔ بہرحال میں شدید متاثر ہوا ہوں۔ قنوطیت مجھے مشکل لگنے لگی ہے۔ بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سوال کلبلا رہا ہے، کہ اس پرجوش ملک کا راز کیا ہے؟ کیا بالشویکوں کو اس راز کا پتہ ہے؟ کیا ان کو بھی معلوم ہے کہ اس ملک کے پیچھے کوئی راز ہے؟............

خدا جانے!!

پیٹروگراڈ

13 مئی 1920ء

یہ ایک عجب دنیا میں آگیا ہوں میں۔ یہ دم توڑتے حسن اور کرخت ودرشت زندگی کی دنیا ہے۔ ہر گام مجھے یہاں کچھ بنیادی، خوفناک اور ناقابلِ حل سوالوں سے پالا پڑتا ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو عقل مند لوگ نہیں پوچھا کرتے۔ یہاں ایک طرف ویران محل ہیں اور دوسری طرف اشیائے خوردونوش کے پرہجوم مراکز۔ ایک طرف پرانی شان وشوکت کو خاک میں ملا دیا گیا ہے یا عجائب گھروں میں سجا دیا گیا ہے۔ دوسری طرف شہر میں چار سو اثرات کی زد میں آئے ہوئے مہاجرین کی خوداعتمادی کے بے قابو مظاہرے ہیں۔ ہر شے کو ابھی ترتیب میں آنا ہے۔ یہاں تنظیم کاری اور منقسم انصاف کو فروغ حاصل ہے؛ کہ سب کو ایک جیسی تعلیم ملے گی۔ ایک جیسے کپڑے، ایک جیسے مکان ملیں

گے۔سب کے لئے ایک جیسی کتابیں ہوں گی اور سب کے لئے ایک جیسا 'عقیدہ' بھی۔ یہ سب یقیناً نہایت منصفانہ ہے۔اس میں حسد کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

یہ تمام خیالات جب میرے ذہن میں آتے ہیں تو پھر میں دلیل کے دوسرے رخ پر غور کرتا ہوں۔ مجھے دوستوفسکی کا ناول 'جرم وسزا' گورکی کا 'اس دنیا میں' اور ٹالسٹائی کا 'رستخیز' یاد آتے ہیں۔ میں اس بربریت اور تباہی پر غور کرتا ہوں جس پر عظمتِ رفتہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ میرے ذہن میں اس افلاس، بدمستی اور عصمت فروشی کے تصورات آتے ہیں جن میں زندگی اور صحت کو بے کار میں ضائع کیا جاتا تھا۔ میں ان تمام آزادی کے متوالوں سے متعلق سوچتا ہوں جنہوں نے عقوبت خانوں میں تشدد سہا۔ میں کوڑوں کی سزاؤں، نسل کشیوں اور قتلِ عام کو یاد کرتا ہوں۔قدیم نظام سے نفرت کے باعث میں نئے کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتا ہوں۔مگر میں اس نئے کو خود اُس کے باعث پسند نہیں کر پاتا۔

اس نظام کو پسند نہ کر پانے پر میں کود کو لعنت ملامت کرتا ہوں۔حالانکہ اس میں ایک زبردست آغاز کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ یہ خوبصورت اور رحم دل نہیں لیکن ساتھ ہی تعمیری توانائی سے بھرپور بھی ہے۔ جو کچھ وہ بنا رہا ہے، اس کی قدر و قیمت میں یقین بھی رکھتا ہے۔سماجی زندگی کے لئے وہ ایک نیا نظام وضع کر رہا ہے، اور ایسا کرتے ہوئے نظام سے آگے سوچنے کی اسے فرصت ہی نہیں۔ جب نئے سماج کا ڈھانچہ بن جائے گا تو پھر اس میں روح پھونکنے کے سوال پر غور کرنے کے لئے مہلت بھی مل ہی جائے گی..........کم از کم مجھے یہی یقین دہانی کرائی جا رہی ہے۔سو یہ لوگ مجھے ایک مخصوص بے تابی کے ساتھ بتاتے ہیں، ''نئے آرٹ یا نئے مذہب کے لئے ہمارے پاس کوئی وقت نہیں......'' اور میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پہلے ڈھانچہ بنا لیں اور پھر بعد میں جب وقت ملے تو اس میں مطلوبہ حد تک روح پھونک دیں۔شاید ایسا ممکن ہو..........مگر میں مطمئن نہیں!

ان تمام سوالوں کا مجھے کوئی نظری جواب نہیں ملتا۔میرے جذبات البتہ ایک زبردست اصرار کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ میں اس ماحول میں انتہائی رنجیدہ خاطر ہوں۔اس کی افادیت

پرستی سے، محبت، حسن اور جذباتی زندگی سے اس کی بے نیازی سے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں انسان کی حیوانی ضروریات کو وہ اہمیت نہیں دے سکتا جو یہاں کے حکمران دے رہے ہیں۔ بلاشبہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے ان میں سے اکثر لوگوں کی طرح اپنی آدھی زندگی بھوک اور محرومی کے عالم میں نہیں گزاری۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بھوک اور محرومی سے ہمیشہ دانائی ہی جنم لیتی ہے؟ کیا محض بھوک اور محرومی کے باعث انسان کسی نہ کسی حد تک مثالی معاشرہ کا ادراک کرنے کے قابل ہو جاتا ہے؟

میں اس اعتقاد کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ افق میں وسعت کی بجائے، اس میں تنگی پیدا کر رہے ہیں۔ اضطراب انگیز اور بے چین کر دینے والا شبہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ یوں میں مزید بے چین ہو جاتا ہوں۔

دوسری بیوی..........ڈورا

جنگ کے خاتمے تک کولٹی سے میرے تعلقات کی نوعیت بدل چکی تھی۔ جنگ کے زمانے میں ہم مل کر کئی کام کر سکتے تھے کیونکہ جنگ سے متعلق ہمارے جذبات کی شدت یکساں تھی۔ جنگ کے بعد حالات مزید کٹھن اور پریشان کن ہو گئے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم اپنے تئیں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر ہر بار یہ جدائی غیر متوقع طور پر عارضی ثابت ہوئی۔

1919ء کے موسم گرما میں، ریاضی دان لٹل وڈ اور میں نے مل کر لل ورتھ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی پہ واقع فارم ہاؤس تین ماہ کے لئے کرائے پہ لے لیا۔ اس عمارت میں متعدد کمرے تھے اور اس دوران ہمارے ہاں بیشتر مہمانوں کی آمد و رفت رہی۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی، جہاں سے دُور تک ساحل کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

یہی وہ ایام تھے جب میں (بعد ازاں ہونے والی) اپنی دوسری بیوی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات، اس کی سہیلی ڈورتھی ورنچ کے توسط سے 1916ء میں ہو چکی تھی۔ وہ دونوں گرٹن میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں اور ڈورتھی میری طالبہ تھی۔ 1916ء میں اس نے

ڈورا بلیک، ژیاں نکوڈ اور میرے ساتھ مل کر دو روزہ واک کا اہتمام کیا تھا۔ ژاں نکوڈ نوجوان فرانسیسی فلسفی تھا۔ وہ بھی میرا شاگرد تھا۔ ٹی بی کا مرض ہونے کے باعث اس کو جنگ میں جبری بھرتی سے نجات مل گئی تھی۔ پھیپھڑوں کے دق نے 1924ء میں اس کی جان لے لی۔ اس جیسے راحت بخش لوگ میں نے زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ وہ نہایت شریف النفس ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ذہین اور ہوشیار بھی تھا۔ وہ میرا دل لبھانے والی من موجی مزاح کی زبردست صلاحیت کا مالک تھا۔ ایک بار میں نے اس سے کہا کہ فلسفے کے طالب علموں کو یونیورسٹیوں کے رواج کے مطابق محض پرانے فلسفیوں کے فکری نظام کو سمجھنے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ دنیا کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ "جی ہاں" میرے بات کے جواب میں وہ کہنے لگا، "مگر یہ بھی تو دیکھیے وہ فکری نظام اس دنیا سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں"۔

بہر حال، ڈورا بلیک کو میں اس سے قبل نہیں جانتا تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں میرا دھیان کھینچ لیا۔ اس سے جدا ہونے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔ سو، ڈنر کے بعد بھی کچھ وقت لینے کے لئے میں نے سب سے یہ استفسار کیا کہ زندگی میں ان کی سب سے بڑی آرزو کیا ہے۔ مجھے اب یاد نہیں کہ ڈورتھی اور نکوڈ نے کیا جواب دیا تھا، البتہ میں نے کہا تھا کہ میں آرنلڈ بینیٹ کے ناول Buried Alive کے کردار کی طرح غائب ہو جانا چاہوں گا، بشرطیکہ مجھے بھی اس کی طرح پٹنہ میں ایک بیوہ سے ملاپ کا یقین ہو جائے۔ جبکہ ڈورا کی بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ شادی کر کے بچے پیدا کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس وقت تک میں یہ سوچتا تھا کہ کوئی چالاک، ہشیار نوجوان عورت اس قسم کی سادہ خواہش کی آرزو نہیں کر سکتی۔ اس لئے ڈورا کی خواہش کے نتیجے میں، اس سے متعلق میں نے یہ رائے بنائی کہ وہ خلوص کا پتلا ہے۔ جبکہ تب وہ (میری طرح) جنگ مخالف نہ تھی۔

ڈورتھی ورنچ کے کہنے پر میں نے جون 1919ء میں اسے ایلن کے ساتھ چائے کی دعوت دی۔ یہ دعوت پیٹری میں میرے اور ایلن کے مشترکہ فلیٹ پہ ہوئی۔ اس کے آنے پر ہم نے باپ کے حقوق پر زبردست مباحثہ شروع کر دیا۔ ڈورا کا کہنا تھا کہ اس کے جب بچے ہوں گے تو وہ

اپنے بچوں کو مکمل طور پر اپنا سمجھے گی اور ان کے باپ کا کوئی حق تسلیم نہیں کرے گی۔ جس پر میں نے استہزا میں اس سے کہا: "خیر، میرے بچے خواہ جس سے بھی ہوں، تم سے تو نہ ہوں گے......"

اس بحث کے نتیجے میں دوسری شام ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ اس شام یہ طے پایا کہ طویل و تفصیلی ملاقات کے لئے ڈورا کو لل ورتھ آنا چاہئے۔

اسی روز کولٹی کے ساتھ میرا شدید نوعیت کا جھگڑا ہو تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اب اس سے دوبارہ کبھی نہیں مل پاؤں گا۔ مگر ہوا یہ کہ میں اور لٹل وڈ جونہی لل ورتھ پہنچے، اس سے اگلے روز کولٹی کا تار آ گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ کرائے کی کار لے کر ہمارے ہاں آ رہی ہے۔ حسنِ اتفاق سے ڈورا کے آنے میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ بہر حال اس سارے موسم گرما میں ان دونوں کے وقت کو الگ الگ رکھنے میں مجھے خاصی دشواری اور ناگواری کا سامنا کرنا پڑا۔

درج بالا عبارت میں نے پہلے 1931ء میں لکھی تھی۔ اٹھارہ برس بعد 1949ء میں یہ عبارت میں نے کولٹی کو دکھائی۔ کولٹی نے اس پر مجھے خط لکھا اور ساتھ ہی میرے دو خطوط بھی بھیجے جو میں نے 1919ء میں اسے لکھے تھے۔ ان سے مجھے پتہ چلا کہ کتنی ساری باتیں میں بھول گیا تھا۔ پرانے خط پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ لل ورتھ میں قیام کے دوران میں جذباتی کشمکش کا شکار رہا تھا۔ کولٹی کے رویے میں ذرا سا اتار چڑھاؤ مجھے تذبذب میں ڈال دیتا تھا۔ کبھی تو وہ اپنی وارفتگی اور وفاداری جتلاتی اور کبھی ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کا عزم دہراتی۔ تیسرا رویہ ان دونوں کے مابین تھا، جب وہ ہلکی سے بے رخی اور بے اعتنائی کا مظاہرہ کرنے لگتی۔ اس کے رویے کے یہ تینوں پہلو میرے اندر بازگشت بن کر گونجتے رہتے۔ بہر حال کولٹی نے میرے جو دو پرانے خطوط بھیجے، ان سے پتہ چلتا تھا کہ یہ صدائے بازگشت اس سے کہیں زیادہ گونجدار تھی، جتنی کہ میں اب محسوس کرتا تھا۔ یہ خطوط میرے حافظے کی کمزوری کا ثبوت ہیں۔

ڈورا لل ورتھ آئی تو ہمارے بیچ محبت کا تعلق استوار ہونے لگا۔ اس کے ساتھ گزرے ہوئے گرمیوں کے دن مسرت انگیز رہے۔ اس کی نسبت کولٹی کے معاملے میں ایک مشکل یہ تھی کہ وہ بچے پیدا

کرنے پر تیار نہیں تھی۔ جبکہ ادھر میں یہ سوچتا تھا کہ اگر مجھے بچے پیدا کرنے ہی ہیں تو مجھے مزید تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔اور ڈورا بچوں کے لئے بالکل تیار تھی۔ اسے تو شادی کے بغیر بھی ماں بننے میں کوئی تامل نہ تھا۔شاید اسی لئے اپنے تعلقات کی ابتدا ہی سے ہم نے کسی احتیاطی تدبیر کی ضرورت محسوس نہ کی۔ البتہ یہ جان کروہ کچھ افسردہ ضرور ہوئی کہ کسی رسمی تقاضے کے بغیر ہی ہمارے معاملے نے کم وبیش ازدواجی تعلق کی صورت اختیار کرلی تھی۔ میں نے جب اسے بتایا کہ جلد ہی طلاق لے کر میں اس سے شادی کرلوں گا، تو وہ رونے لگ گئی۔ شاید اسے یہ لگا کہ شادی سے اس کی آزادی اور بے فکری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بہر حال ،ایک دوسرے کے لئے ہمارے جذبات میں وہ استحکام چھلکتا تھا جو ایک سنجیدہ تعلق کی ضرورت ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے ڈورا کو محض اس کی عوامی حیثیت میں دیکھا ہے، وہ شاید ہی یہ جانتے ہوں کہ وہ ایک ساحرانہ دلربائی کی مالک بھی تھی۔ یہ دلربائی اس وقت ابھر کر آتی، جب وہ کسی سماجی ذمہ داری سے آزاد ہوتی۔ چاند کی روشنی میں نہاتے یا شبنمی گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے وہ میرے تخیل کو مکمل طور پر قابو کر لیتی۔ جیسے اس کی شخصیت کے سنجیدہ پن نے میرے باپ بننے کی خواہش اور سماجی ذمہ داری کے جذبوں کو جلا دی تھی۔

لل ورتھ میں ہمارے دن کا بیشتر حصہ بیرونی سرگرمیوں بالخصوص تیراکی اور گپ شپ میں گذرتا۔ بے فکری کے ایسے خوشگوار دن آدمی کو زندگی میں کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔

میں روس جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ڈورا ساتھ جانے پر بضد تھی۔ میرا موقف یہ تھا کہ چونکہ سیاست میں اس کی کوئی دلچسپی نہیں، اس لئے اس کے سوویت روس جانے کا کوئی جواز نہیں۔ ان دنوں ٹائفس کی وبا بھی پھیل رہی تھی۔ میں اس لئے بھی ڈورا کو ساتھ لے جانے اور اس مرض کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ دونوں ضدی تھے، اس لئے مفاہمت کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

میجر کا سے واپسی کے فوراً بعد ایک موقع میرے ہاتھ لگا۔ لیبر پارٹی کا ایک وفد روس جا رہا تھا اور وہ مجھے بھی ساتھ لے جانے پر آمادہ تھے۔ میں نے جانے کے لئے درخواست دے

دی۔حکومت نے اس پر غور کیا اور پھر مجھے ایچ،اے ویل فشر کے سامنے انٹرویو کے لئے پیش ہونے کو کہا گیا۔بہرکیف انٹرویو کے بعد مجھے جانے کی اجازت دے دی گئی۔البتہ سوویت حکومت کی رضامندی حاصل کرنا زیادہ مشکل ثابت ہوا۔جب میں روس جانے کے لئے سٹاک ہوم پہنچ چکا تھا، تب بھی لیتنوف اجازت دینے سے انکاری تھا۔یہاں میں یہ بتادوں کہ ہم دونوں ایک زمانے میں برکس ٹون میں ایک ہی جیل میں اکٹھے رہ چکے تھے۔آخرکار سوویت حکومت کے اعتراضات دور کر دیے گئے اور روس جانے کا رستہ صاف ہو گیا۔

اُن دنوں بعض مغربی طاقتوں نے روس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔اس لئے خطوط یا ٹیلی گرام کے ذریعے کوئی رابطہ ممکن نہ تھا۔تاہم میں نے ریوال پہنچتے ہی ڈورا کے نام تار دینا شروع کر دیے۔مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔آخرکار (واپسی پر) اسٹاک ہوم پہنچ کر میں نے دوبارہ کوشش کی۔اس بار یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کہاں ہے، میں نے پیرس میں اس کے دوستوں کو تار دیے۔جواب آیا کہ آخری بار یہ سنا گیا تھا کہ وہ اسٹاک ہوم میں ہے۔میں نے سوچا شاید وہ مجھے لینے آئی ہو۔چوبیس گھنٹے اس سے ملنے کی آس میں بیت گئے۔وہ نہ آئی۔تب اتفاقاً ایک فِن شہری سے پتہ چلا کہ ڈورا نارتھ کیمپ کے راستے روس گئی ہے۔مجھے احساس ہو گیا کہ روس جانے کے مسئلے پر ہماری لمبی لڑائی کی یہ ایک چال ہے۔لیکن میرے لئے پریشانی کا باعث یہ امر تھا کہ روسی کہیں اسے کہیں قید ہی نہ کر دیں، کیونکہ انہیں ڈورا کے آنے کا سبب معلوم نہ ہوگا۔لیکن اب کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا، اس لئے میں برطانیہ واپس آ گیا۔

سوویت روس سے پہنچنے والا صدمہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔اس لئے اس کی شدت کم کرنے کے لئے میں نے اپنے حواس پر قابو پائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔چند روز بعد ڈورا کے خط موصول ہونے لگے۔یہ خطوط دوستوں کی مدد سے روس سے باہر لائے جاتے تھے۔مجھے یہ دیکھ

کر حیرت ہوئی کہ مجھے روس سے جس قدر کراہت آنے لگی تھی، ڈورا کو روس اتنا ہی بھایا تھا۔ میں سوچنے لگا ہمارے نقطہ نظر کی اس بڑی تقسیم پر کیا ہم قابو پا سکیں گے؟!

بہرحال، واپس آ کر میں نے اس دوران آنے والے خطوط دیکھے۔ ان میں ایک چین سے موصول ہونے والا خط تھا۔ اس خط میں مجھے چائینز لیکچر ایسوسی ایشن کی جانب سے چین میں ایک سال تک لیکچر دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ خالص چینی تنظیم تھی جو ہر سال ایک معروف غیر ملکی شخصیت کو لیکچرز کے لئے بلواتی تھی۔ گذشتہ برس انہوں نے ڈاکٹر ڈیوی کو بلایا تھا۔ میں نے یہ طے کر لیا کہ اگر ڈورا میرے ساتھ جانے پر رضامند ہوئی تو میں چین جاؤں گا، ورنہ معذرت کر لوں گا۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ روس کے محاصرے کی وجہ سے ڈورا سے رابطہ ممکن نہ تھا۔

ریوال کا آرتھر واٹس نامی ایک کوئیکر میرا واقف کار تھا۔ یہ کوئیکر اعانت کے سلسلے میں اکثر روس جاتا رہتا تھا۔ میں نے کئی پونڈ خرچ کر کے اسے ایک طویل تار بھیجا، جس میں تفصیل سے ساری صورتحال بیان کی۔ میں نے اسے لکھا کہ ممکن ہو تو وہ ڈورا کو تلاش کرے اور ساری صورتحال سے اسے مطلع کرے۔ خوش قسمتی سے یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ چین جانے کے لئے ڈورا کا واپس آنا ضروری تھا۔ بالشویکوں کو پہلے تو یہ لگا کہ میں ان کے ساتھ شاید کوئی چال چل رہا ہوں۔ لیکن آخرکار معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ ڈورا واپس آ گئی۔

ہماری ملاقات اتوار کے روز فن چرچ اسٹریٹ میں ہوئی۔ پہلے تو ہم دو باہم مخالف ناآشناؤں کی طرح ملے۔ سوویت کمیونسٹوں پر میرے اعتراضات کو وہ بورژوا، فرسودہ اور جذباتی قرار دیتی رہی۔ ان لوگوں کے لئے ڈورا کی لگن نے مجھے حیران کر دیا اور ساتھ ہی خوفزدہ بھی۔ اس کے بقول روس میں اس کی ملاقات ایسے افراد سے ہوئی جن کے رویے اسے ہر لحاظ سے میرے رویوں سے اعلیٰ وارفع لگے۔

بہرکیف، ان تمام فروعی جھگڑوں کے باوجود ہم نے ایک سال کے لئے چین جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ الفاظ سے بلکہ ہمارے شعوری خیالات سے بھی ماورا کسی قوت نے ہمیں ایک

دوسرے سے یوں باہم منسلک کئے رکھا کہ ایک دوسرے کے لئے کسی بھی عمل میں دونوں ثابت قدم رہے۔کام اتنا زیادہ تھا کہ واقعتاً ہمیں دن رات ایک کرنا پڑا۔ہم نے کپڑے خریدنے تھے، پاسپورٹ تیار کروانے تھے،دوستوں اور عزیزوں کوالوداع کہنا تھا۔طویل سفر کی دوڑ دھوپ اس کے علاوہ تھی۔ میں ساتھ ہی ساتھ ایک کام اور بھی کر رہا تھا۔میری کوشش تھی کہ چین میں قیام کے دوران ہی میں طلاق حاصل کرلوں۔لہٰذا فی الوقت اپنی راتیں باضابطہ زنا کاری کی نذر کرنا لازم ہوگیا۔سراغ رساں اس قدر احمق تھے کہ مجھے یہ کام بار ہا کرنا پڑا۔بالآخر تمام معاملات طے گئے۔

اپنی معمول کی مہارت سے ڈورا نے اپنے والدین کو یوں رضامند کرلیا کہ وہ بیچارے وکٹوریہ اسٹیشن پہ ہمیں الوداع کہنے یوں آئے کہ جیسے ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہواور وہ ہمیں رخصت کر رہے ہوں۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ ڈورا کے والدین مکمل طور پر رواج پرست تھے۔

ٹرین جب وکٹوریہ اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو حالیہ عرصے کے سارے ڈراؤنے خواب، الجھنیں اور مصائب پیچھے رہ گئے۔ایک نیا باب شروع ہوگیا۔

شنگھائی پہنچ کر حیرت ہوئی کہ کوئی استقبال کو موجود نہ تھا۔مجھے نجانے کیوں اول دن سے ہی یہ شک ہوگیا تھا کہ چین سے آنے والی دعوت کی آڑ میں شاید کسی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔اسی لئے اس شک سے بچنے کے لئے میں نے اپنے میزبانوں سے سفری خرچ پہلے ہی لے لیا تھا۔میرا خیال تھا کہ محض مزاق کے لئے کوئی بے وقوف آدمی ہی سوا سو پونڈ ادا کرے گا۔بہرحال،شنگھائی پہنچنے پر یہ اس شک نے پھر سر اٹھالیا۔ہم دونوں نے یہ سوچنا شروع کردیا کہ اب ہمیں شرمسار ہوکر واپس لوٹنا پڑے گا۔لیکن خیر ہوئی، پتہ چلا کہ جہاز کی آمد کے اوقات سے متعلق ہمارے میزبانوں کو ذرا سی غلط فہمی ہوگئی تھی۔سو کچھ ہی دیر میں وہ عرشے پر آگئے اور ہمیں ایک چینی ہوٹل میں لے آئے۔

اس ہوٹل میں گزارے ہوئے تین دن میری زندگی کے ناقابلِ فراموش ایام میں سے تھے۔ پہلے تو ڈورا کے معاملے نے مشکل کھڑی کر دی۔ معاملہ یہ ہوا کہ چینی میزبان اسے میری بیوی سمجھ رہے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ہم شادی شدہ نہیں ہیں، تب پہلے تو وہ سٹپٹائے کہ شاید ان کی غلط فہمی کا میں نے برا منا لیا ہے۔ لیکن میں نے انہیں بتایا کہ میں چاہتا ہوں کہ ڈورا کے ساتھ میری بیوی جیسا ہی سلوک کیا جائے۔ سو انہوں نے اس ضمن میں ایک بیان چینی اخبارات میں شائع کروا دیا۔ تب سے لے کر ہمارے قیام کے آخری لمحے تک ہر چینی اس سے انتہائی شائستگی اور احترام سے پیش آتا رہا۔ ہر جگہ اس کے ساتھ میری بیوی کے بطور سلوک کیا گیا۔ باوجود اس کے کہ ہم ڈورا کو 'مس بلیک' پکارنے پر اصرار کرتے رہے، ان کا رویہ وہی رہا۔

............میں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ چین سے واپسی کے بعد میں جاپان میں لیکچرز دوں گا۔ نئی صورتِ حال میں (بیماری کے باعث) مجبوراً میں نے وہاں صرف ایک ہی لیکچر دینے اور بعض احباب سے ملنے پر اکتفا کیا۔ ہم نے وہاں بارہ مصروف دن گزارے جو گو کہ دلچسپ تھے مگر انہیں مسرت انگیز قرار دینا مشکل ہی ہوگا۔ چینیوں کے برعکس اچھے آداب اور برتاؤ کے معاملے میں جاپانیوں کا رویہ مایوس کن تھا۔ یہ جاننا انتہائی ناگوار تھا کہ وہ مداخلتِ بے جا سے بھی پرہیز نہیں کرتے تھے۔

میں ابھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ کچھ نقاہت ابھی محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے ہم لوگ غیر ضروری مشقت سے گریز کر رہے تھے۔ مگر صحافی سر پر سوار رہتے۔ جب ہمارا جہاز جاپان کی پہلی بندرگاہ پہ پہنچا تو وہاں تقریباً تیس صحافی پہلے سے موجود تھے۔ حالانکہ ہم نے اپنے سفر کو پوشیدہ رکھنے کی بہتیری کوششیں کی تھیں۔ پتہ چلا کہ انہیں پولیس کے توسط سے ہماری نقل و حرکت کی اطلاع ہو گئی تھی۔ خیر یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ (چین میں بیماری کے دوران) جاپانی اخبارات میری

موت کی افواہ اڑا چکے تھے، اور جب بعدازاں ہم نے اس کی تردید کی تو جاپانی اخبارات نے اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ ڈورا نے اب ان تمام صحافیوں کو کاغذ کا ایک ٹائپ شدہ ٹکڑا تھما دیا جس پہ لکھا تھا کہ کیونکہ میں مر چکا ہوں، اس لئے میرا انٹرویو نہیں لیا جا سکتا۔ اس پر انہوں نے ایک لمبی سانس لے کر کہا، "واہ، کیا خوب لطیفہ ہے!"

شدید گرمی کے موسم میں ہم نے کیوٹو سے یوکوہاما تک مسلسل دس گھنٹوں کا سفر کیا۔ ہم شام ڈھلے ہوئے وہاں پہنچے۔ وہاں مکنشیم کے دھماکوں سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ ہر دھماکے پہ ڈورا اچھل پڑتی اور حمل ضائع ہونے سے متعلق میرا خوف بڑھ جاتا۔ اس صورتِ حال نے مجھے غصے سے پاگل کر دیا۔ مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں دھماکے کرنے والے لڑکوں کی جانب لپکا، لیکن چال میں لڑکھڑاہٹ کے باعث ان تک نہ پہنچ سکا۔ اس لئے وہ میرے ہاتھ نہ آ سکے۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ ان میں سے کوئی بھی میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔ ایک مہم جو فوٹوگرافر نے خدا جانے کیسے اس کیفیت میں میری تصویریں اتار لیں جب میری آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ یہ تصویر دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں اس قدر جنونی بھی نظر آ سکتا ہوں۔ بعدازاں یہ تصویر ٹوکیو میں میرا تعارف بنی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لمحے میں وہی جذبہ محسوس کر رہا تھا جو جنگ کے دوران اینگلو انڈین نے یا پھر سیاہ فام باغیوں کے ہجوم میں گھرے کسی سفید فام نے محسوس کیا ہوگا۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ کسی غیر ملکی نسل کے ہاتھوں اپنے خاندان کو نقصان پہنچانے کا جذبہ شاید انسان کا سب سے زیادہ غضبناک اور جنوں خیز جذبہ ہے۔

جاپان میں میرا آخری تجربہ ایک قوم پرست جریدہ میں جاپانی قوم کے نام میرے الوداعی پیغام کی اشاعت تھی۔ اس میں جاپانیوں کو مزید جارحانہ قومی جذبہ پیدا کرنے کو کہا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ میں نے یہ یا ایسا اور کوئی پیغام اس جریدے یا کسی بھی جاپانی اخبار کو دیا ہی نہیں تھا۔

وطن واپس جانے کے لئے ہم یوکوہاما سے جہاز میں سوار ہوئے۔ مس اوٹو اور اس کا نراجی دوست اوڑ کی ہمیں الوداع کہنے آئے۔ 'ملکہ ایشیا' نامی اس جہاز میں ہمیں سماجی ماحول کی فوری تبدیلی کا تجربہ ہوا۔ ڈورا کی حالت ابھی ایسی نہ تھی کہ عام آدمی اس کے حاملہ ہونے کا اندازہ کر سکتا۔ لیکن ہمیں اندازہ ہوا کہ جہاز کا ڈاکٹر اپنی پیشہ ور نگاہیں اس پہ مرکوز کئے ہوئے ہے۔ پھر پتہ چلا کہ اس نے دیگر مسافروں کو بھی اپنے اس زریں مشاہدے سے مطلع کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مسافروں کی اکثریت نے ہم سے بات چیت موقوف کر دی۔ یہ اور بات کہ ہمارے ساتھ تصویریں لینے کو سبھی اُتاولے سے ہوئے جا رہے تھے۔ پورے جہاز میں صرف وائلن بجانے والے مسجا المان اور اس کے ساتھی ہم سے بات چیت پہ رضامند تھے۔ جہاز کا ہر مسافر اس سے بات چیت کا خواہشمند تھا لیکن وہ صرف ہمارے پاس ہی آ کر بیٹھا رہتا۔ لوگوں کو یہ بات بھی مشتعل کئے دیتی تھی۔

ایک بیزار کن سفر کے بعد ہی اگست کے آخر میں لیورپول پہنچے۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی اور لوگ خشک سالی سے نالاں نظر آتے تھے۔ اس سے ہم نے جان لیا کہ ہم وطن واپس پہنچ گئے ہیں۔ ڈورا کی والدہ گھاٹ پہ ہمارے استقبال کو آئی ہوئی تھیں۔ ڈورا کی حالت کے پیشِ نظر وہ اپنی بیٹی کو کچھ مفید مشورے بھی دینا چاہتی تھیں، مگر مارے شرم کے انہیں وہاں یہ کام سخت کٹھن معلوم ہو رہا تھا۔

بہرحال، 27 ستمبر کو ہم دونوں نے شادی کر لی۔ اگرچہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے مجھے چیئرنگ کراس کے پلیٹ فارم خدا کی قسم کھا کر یہ اعتراف کرنا پڑا کہ میری زندگی میں ڈورا ہی وہ واحد عورت ہے، جس کے ساتھ مجھے 'باضابطہ زناکاری' کا ارتکاب کرنا پڑا۔

16 نومبر 1920ء کو میرا بیٹا جان پیدا ہوا۔ تب سے آنے والے کئی برسوں تک میرے بچے میری زندگی کی دلچسپی کا مرکز و محور رہے۔

1894ء میں جب ڈاکٹر کا فیصلہ سننے کے بعد میں نے ایلس کے ساتھ رچمنڈ گرین میں

واک کی تھی، تب سے میں بچے کی خواہش کو دباتا چلا آیا تھا۔ مگر اندر ہی اندر یہ خواہش مسلسل پروان چڑھتی رہی۔ جب میرا پہلا بچہ پیدا ہوا تو مجھے اس دبے ہوئے جذبے کے زبردست اخراج کا احساس ہوا۔ آئندہ دس برس تک میری بیشتر سرگرمیوں کا محور میرے بچے ہی رہے۔ میرے ذاتی تجربے کے مطابق پدری جذبہ نہایت پیچیدگی کا حامل ہے۔ اول تو یہ کہ اس میں خالص حیوانی محبت شامل ہے۔ چھوٹے بچوں کی شرارتوں اور ان کے طور طریقوں کو دیکھنے میں ایک خاص قسم کی مسرت پوشیدہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں ایک ناگزیر ذمہ داری کا احساس شامل ہے، جو معمول کی سرگرمیوں کے شک سے ماورا ایک مقصد عطا کر دیتی ہے۔ تیسرا یہ کہ اس میں ایک حد تک خودغرضی کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے، جو خطرناک ہے۔ اس کا تعلق اس خواہش سے ہے کہ جہاں میں ناکام ہو گیا، وہاں میرے بچے کامیاب ہو جائیں گے۔ جب بڑھاپا یا موت میری جدوجہد کو ختم کر دے گی تو میرے بچے آگے بڑھیں گے اور اس تسلسل کو جاری رکھیں گے۔ پھر یہ بھی ہے کہ بچے ایک طرح سے حیاتیاتی موت سے نجات مہیا کرتے ہیں۔ انسان ان کی صورت میں خود کو پھلتا پھولتا محسوس کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ موت کے بعد کسی نہ کسی صورت میں وہ ان میں زندہ رہے گا۔

یہ ساری باتیں مجھ پر بھی بیتیں۔ اور انہوں نے کئی برسوں تک مجھے خوشی اور سکون سے ہمکنار کیے رکھا۔

تیسری شادی..........پیٹر سپینس

پیٹر سپینس اور میں نے لگ بھگ ڈیڑھ برس ''ایمبر لے پیپرز'' پہ محنت کی۔ یہ کتاب میرے والدین کی مختصر زندگی کا خاکہ ہے۔ اس دوران کچھ عرصے کے لئے پیٹر سپینس سے میرا معاشقہ بھی چلا۔

1937ء میں، میں نے پیٹر سپینس سے شادی کر لی۔ اگلے برس اُس سے میرا سب سے چھوٹا بیٹا کونارڈ پیدا ہوا۔

1949ء میں میری بیوی پیٹر نے فیصلہ کیا کہ وہ مزید میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ یوں ہماری شادی ختم ہوگئی۔

آخری عشق..........ایڈتھ فنچ

جس چیز نے مجھے (عمر کے آخری حصے کے) گذشتہ دوعشروں کے پاس انگیز اندیشوں اور وسوسوں سے بجات دلانے میں اہم کردار ادا کیا، وہ یہ تھی کہ میں ایڈتھ فنچ کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور اسے بھی مجھ سے محبت ہو گئی۔ وہ لوسی ڈونلے کی قریبی دوست تھی۔ اس صدی (بیسویں صدی) کے اہم موڑ پر لوسی ڈونلے سے میری خاصی صاحب سلامت تھی۔ 1930ء اور 40ء کی دہائیوں میں امریکہ کے مختلف دوروں کے دوران مجھے اس سے ملاقات کے مواقع میسر رہے۔ اس دوران ایڈتھ کو بھی دیکھنے کا موقع ملتا۔ لوسی، بریان ماور میں پروفیسر تھی اور ایڈتھ بھی وہیں پڑھاتی تھی۔ جب سے اس کالج کے صدر کی ایک زن سے میری شادی ہوئی تھی، تب سے اس نامور تعلیمی ادارے سے میرے دوستانہ مراسم قائم تھے۔ نیویارک کے سٹی کالج سے میری برطرفی کے بعد یہ پہلا تعلیمی ادارہ تھا جس نے امریکہ میں میرے بائیکاٹ کو ختم کیا۔ اس کالج کے شعبہ فلسفہ کے پال ویز نے مجھے وہاں لیکچر دینے کی دعوت دی، جسے میں نے نہایت خوشی سے قبول کر لیا۔ بعدازاں "مغربی فلسفے کی تاریخ" کی تالیف کے دوران، بریان ماور کے حکام نے کمال مہربانی سے مجھے کالج کی اعلیٰ لائبریری استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ اس دوران لوسی وفات پا چکی تھی اور ایڈتھ نیویارک میں مقیم تھی۔ 1950ء میں کولمبیا میں لیکچرز کے سلسلے میں جب میں نیویارک گیا تو وہاں ایک بار پھر ایڈتھ سے ملاقات ہوئی۔

یہ تعلق نہایت تیزی سے آگے بڑھا۔ حتیٰ کہ جلد ہی ہم نے مزید جدائی برداشت نہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ بحرِ اوقیانوس ہمارے بیچ حائل تھا، جس سے ہم شدید خائف تھے۔ محبت نے بالآخر فاصلوں کو فتح کر لیا۔ ایڈتھ نیویارک کو خیرباد کہہ کر لندن آ گئی۔ میں ان دنوں رچمنڈ میں رہائش پزیر تھا۔ سو ہماری ملاقاتیں طول پکڑنے لگیں۔ رچمنڈ پارک آج بھی میری یادوں میں مہکتا ہے۔ اس سے میری

کئی یادیں وابستہ ہیں، جن کا سلسلہ بچپن تک جاتا ہے۔ انہیں یاد کرنے سے وہ اور بھی تازہ ہو جاتی ہیں، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے بچپن کے عہد میں چلا گیا ہوں۔ ان یادوں کو دہرانے سے ایٹمی وسوسے بھول سے گئے۔ جب ایڈتھ اور میں پیم بروک لاج کی پھلواریوں سے گزرتے، رچمنڈ پارک اور کیو گارڈنز میں چہل قدمی کرتے تو میں اکثر وہاں اپنے ساتھ پیش آنے والے ماضی کے واقعات کو یاد کرتا رہتا۔ پیم بروک لاج کے باہر ایک فوارہ ہے۔ بچپن میں مجھے پانی کے خوف سے نجات دلانے کے لئے وہاں ایک ملازم رکھا گیا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے ایڑیوں سے پکڑ کر میرا سر پانی میں ڈال دیا۔ جدید تصورات کے برعکس یہ طریقہ نہایت کامیاب رہا۔ پہلی ہی ڈبکی کھانے کے بعد پانی کا خوف ہمیشہ کے لئے میرے دل سے نکل گیا۔

ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کو سنانے کے لئے بہت سے خاندانی قصے اور کہانیاں بھی تھے۔ میرے قصوں کا آغاز ہنری ہشتم سے ہوتا۔ میرا بزرگِ اول اس کا دستِ راست رہا تھا۔ وہ اپنی پہاڑی سے ٹاور پر این بولین کی موت کا سگنل دیکھا کرتا تھا۔ 1815ء میں میرے داد کی تقریر بھی قابلِ روایت تھی۔ واٹرلو سے قبل انہوں نے اپنی اس تقریر میں اس بات پر زور دیا تھا کہ نپولین کی مخالفت نہیں ہونی چاہئے۔ بعدازاں میرے داد نپولین سے ملاقات کے لئے ایلبا تک بھی گئے۔ نپولین ان سے بڑے تپاک سے ملا اور اپنا کان کھجاتا رہا۔.......... یہاں پہنچ کر قصے کے تسلسل میں ایک طویل وقفہ آجاتا ہے۔ اس کے بعد یہ منظر سامنے آتا ہے کہ شاہ سرکاری دورے پر برطانیہ آتا ہے۔ رچمنڈ پارک میں وہ بارش میں پھنس جاتا ہے اور اس طرح پیم بروک لاج (رسل کا خاندانی گھر) میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس موقع پر ہمارے داد نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا گھر نہایت چھوٹا اور معمولی سا ہے۔ یہ سن کر شاہ نے کہا، "بے شک گھر چھوٹا ہے، مگر اس میں آدمی بڑا رہتا ہے۔" پیم بروک لاج سے دریائے ٹیمز کی وادی کا وسیع منظر دکھائی دیتا تھا۔ میری دادی کا کہنا تھا کہ ایک بڑی فیکٹری کی چمنی نے اس خوبصورت منظر کے حسن کا بیڑہ غرق کر کے رکھا ہوا تھا۔ جب ان سے چمنی سے متعلق پوچھا جاتا تو وہ مسکرا کر کہتیں، "اوہ، یہ فیکٹری کی چمنی

نہیں، یہ تو ڈل سیکس کے شہید کی یادگار ہے"۔

میری نسبت ایڈتھ کی خاندانی داستانیں زیادہ رومانوی تھیں۔ 1660ء کے لگ بھگ اس کے خاندان کے بزرگ کو ریڈ انڈینز اٹھا کر لے گئے تھے، اور انہوں نے شاید اس بزرگ کو پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔ ریڈ انڈینز کے حوالے سے اس کے والد کے بچپن کے بھی بہت سے قصے تھے۔ ان دنوں اس کے خاندان نے کولوریڈو میں کچھ عرصہ کے لئے مہاجرین کی سی زندگی گزاری تھی۔ اس قصے میں ان چوباروں کا تذکرہ تھا جو کاٹھیوں اور گدوں سے بھرے پڑے تھے۔ ان پر بیٹھ کر ایڈتھ کے خاندان کے افراد نے نیوانگلینڈ سے فلاڈلفیا میں کانگریس تک گھوڑوں پر سفر کیا تھا۔ اس علاقے میں پہاڑی ندی نالوں میں ڈونگیوں میں سفر اور پیراکی کے بھی قصے شامل تھے۔ جہاں میسا چیوسٹ میں ڈیرفیلڈ کے مقام پر وسیع پیمانے پر قتل عام کے بعد ریڈ انڈینز، یونائیں ولیمز کو اٹھا کر لے گئے تھے اور قتل کر ڈالا تھا۔ اس قصے کو فینی مور کوپر کے ایک باب کے بطور بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ خانہ جنگی کے دنوں میں ایڈتھ کے خاندان کے افراد شمال اور جنوب میں منقسم تھے۔ چنانچہ یہ بھی ہوا کہ دو بھائیوں میں سے ایک شمال کا جرنل تھا اور دوسرا جنوب کا۔ آخر میں جب خانہ جنگی کا فیصلہ ہوا تو شمال والے بھائی نے اپنی تلوار، جیتنے والے جنوب کے بھائی کے سامنے ڈالی۔ ایڈتھ خود نیویارک شہر میں پیدا ہوئی۔ وہیں اس کی پرورش ہوئی۔ اس زمانے کا نیویارک میری نوجوانی کے دنوں جیسا نیویارک تھا۔ جہاں گول پتھروں والی گلیاں تھیں، جس کی سڑکوں پہ بگھیاں دوڑتی تھیں اور کوئی موٹر نہ تھی۔

یہ ساری یادیں نہایت دلچسپ تھیں۔ مگر یہ محض یادوں کے سمندر میں سے چند قطرے تھے۔ جلد ہی ہم دونوں کی یادیں بھی اس مجموعے میں اضافے کا باعث بن گئیں۔ ایک صبح کیو گارڈن میں سیر کرتے ہوئے ہم نے دو افراد کو ایک بینچ پر بیٹھے دیکھا۔ وہ ہم سے کافی فاصلے پر تھے، اس لئے پہچانے میں نہیں آرہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک اٹھا اور تیزی سے ہماری جانب لپکا۔ قریب آکر گھٹنوں کے بل جھک کر وہ میرا ہاتھ چومنے لگا۔ میں کچھ ڈر سا گیا۔ گھبراہٹ میں مجھے کوئی بات ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔ بہرحال اس شخص کے جذبے سے میں اور ایڈتھ دونوں متاثر ہوئے۔ ایڈتھ نے

جلد ہی خود پر قابو لیا۔اسے معلوم ہوا کہ وہ شخص برطانیہ میں رہنے والا ایک جرمن تھا اور کسی بات کے لئے میرا مشکور تھا۔لیکن ہمیں یہ کبھی معلوم نہ ہوسکا کہ وہ شخص کس بات کے لئے شکر گزار تھا۔

رچمنڈ کے آس پاس، لندن میں، دریا کے کنارے اور باغوں میں ہم دونوں خوب گھوما کرتے۔کبھی کبھی موٹر پہ ہم دور بھی نکل جاتے۔ایک بار پورٹ سموتھ روڈ پہ ہمیں ایک حادثہ بھی پیش آ گیا۔اس میں ہماری کوئی غلطی نہ تھی۔درصل ایک گاڑی کی ہمسری موٹر سے ٹکر ہوگئی۔خوش قسمتی سے وہاں بہت سے لوگ موجود تھے جنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس حادثے میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔ہم خاصے گھبرائے تو سہی لیکن مایوس نہ ہوئے۔سو ایک مہربان راہ گیر سے لفٹ لے کر گلڈ فورڈ پہنچے۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر بلیک ڈاؤن آ گئے۔دراصل یہی وہ جگہ تھی جہاں ہم واک کے لئے جا رہے تھے۔وہاں پہنچ کر اس مقام سے متعلق میری بچپن کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔جب میں دو برس کا تھا تو گرمیوں کی تعطیلات میں میرے گھر والوں نے ٹینی سن کا مکان حاصل کیا تھا۔

انہی دنوں ہم دونوں نے بہت سے نئے پرانے کھیل دیکھے جو خاص طور پر مجھے یاد رہ گئے تھے۔ان میں ریجنٹ پارک میں پیش کیا جانے والا ڈرامہ ''سمبلا ئین'' اور اسٹینوف کے دو ڈرامے ''پانچ کرنل'' اور ''چھوٹی کتیا'' شامل ہیں۔میرے کزن ماود رسل نے ہمیں ایک تقریب میں مدعو کیا جو نیشنل گیلری میں بورس انرپ کے ڈیزائن کردہ موزیک فلور کی کامیابیوں کے حوالے سے منعقد کی گئی تھی۔وہاں چند معاصرین کے ساتھ میرا پورٹریٹ آویزاں ہے۔بالائی دھڑ کا مجسمہ بنوانے کے لئے میں جیکٹ ایپس ٹین کے روبرو بیٹھنے سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔وہ مجسمہ اب بھی میرے پاس ہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اب فضول سی لگتی ہیں۔لیکن اس زمانے میں وہ ایک دوسرے کو دریافت کرنے اور ایک دوسرے سے لطف لینے کا بہانہ تھیں۔ایک دوسرے کی صحبت سے ہم دونوں اس قدر مسرور تھے کہ عارضی طور پر وحشی دنیا ہمیں یاد نہ رہی تھی۔ہم صرف اپنے متعلق، اور ایک دوسرے کے متعلق سوچنے لگے تھے۔ہم نے دیکھا کہ نہ صرف ہم ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے بلکہ اہم بات یہ بھی تھی کہ ہمارے مزاج اور احساسات گہرے طور پر ہمدردانہ تھے اور ہمارے مفادات

بھی یکساں تھے۔ایڈتھ فلسفہ اور ریاضی سے نابلد تھی، لیکن ساتھ ہی ایسی کئی چیزیں بھی تھیں جن سے میں بے بہرہ تھا لیکن وہ ان سے متعلق خوب جانتی تھی۔ بہر حال، دنیا اور اہلِ دنیا سے متعلق ہمارا رویہ ایک ہی تھا۔ایک دوسرے کی صحبت اور ایک دوسرے کی رفاقت سے ملنے والی مسرت میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا ہے، اور یوں لگتا ہے کہ کسی حد کے بغیر یہ بڑھتی ہی چلی جائے گی۔اس نے ہم دونوں کو وہ مسرت عطا کی ہے جو عمر کے اس حصے میں ہماری زندگی کی بنیاد بن گئی ہے۔اب جو کچھ یہاں میں بیان کروں گا، ایڈتھ اس کا ناگزیر حصہ ہوگی۔

ہم نے پہلا طویل سفر فاونٹین بلیو کی طرف کیا تھا۔یہ وہ دن تھے جب ایران میں مصدق نے ایرانی تیل پر اجارہ داری حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی وجہ سے ہمارے ہاں بے چینی پائی جاتی تھی۔اس کے باوجود ہماری مسرت انگیز سرگرمیاں اس اضطرب سے یوں بے خبر تھیں جتنی کہ کسی خاموش نگر میں ہوسکتی ہیں۔وہ روشن اور گرم دن تھے۔ہم پیرس چلے گئے جہاں فرانسیسی ریڈیو نے غیر متوقع طور پر گذشتہ خدمات کے عوض مجھے اس قدر نقد معاوضہ ادا کیا کہ ہم نے ایک مہنگے ہوٹل میں لنچ کیا اور کئی چھوٹے موٹے کام بھی کرالئے۔پیرس میں ہم نے ٹیولیرلیس گارڈنز میں سیر کی اور نوٹرے ڈیم کو بھی دیکھا۔ہم دونوں بے انتہا خوش تھے اور ہنستے رہتے تھے۔کبھی کبھی تو بلاوجہ بھی ہنسا کرتے۔

اس کے بعد بھی ہم تعطیلات میں پیرس جاتے رہے۔1954ء کی سیاحت تو یادگار ہے۔ہم نے اس دوران فیصلہ کیا کہ صرف مناظر دیکھیں گے۔ہم دونوں کو کافی عرصہ پیرس میں رہنے کا تجربہ تھا۔لیکن میں نے شہر کی کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں دیکھی تھی۔دریا کی سیر کرنا، مختلف گرجا گھروں اور گیلریوں کو دیکھنا، نیز پھولوں اور پرندوں کے بازار میں جانا مجھے اچھا لگا۔خیر، کبھی کبھار ہمیں مشکلات بھی درپیش آئیں۔جیسے ایک بار ہم ایک گرجا گھر دیکھنے گئے تو وہ آئس لینڈ کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔وہاں انہیں اس گرجا گھر کی خوبصورتیوں پر لیکچر دیا جارہا تھا۔مجھے دیکھتے ہی لیکچر کو چھوڑ کر وہ یوں میرے گرد جمع ہوگئے جیسے میں ہی وہاں کی قابلِ دید چیز تھا۔سوائے گلے روز میں ہم

چارٹرز گئے، جو ہم دونوں کا پسندیدہ تھا۔ مگر یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اسے سیاحوں کا روایتی طرز کا بڑا مرکز بنا دیا گیا تھا۔

1952ء کے موسمِ بہار میں ہم دونوں یونان گئے۔ کچھ عرصہ ہم نے ایتھنز میں گزارا، اور پھر تقریباً دس روز تک ہم موٹر پر پیلوپینس کی سیاحت کرتے رہے۔ دوسروں کی طرح ہم نے بھی سب سے پہلے ایکروپلس کی راہ لی۔ ایک رستے کو غلطی سے مختصر سمجھ کر ہم اس پہ چل پڑے اور ایکروپولس کی پشت کی طرف سے پہنچے۔ یہ راستہ بھی خاصا دشوار تھا۔ بعد میں عمومی رستوں سے ہم وہاں کئی بار گئے۔ چاندنی میں اس کا حسن دیکھنے لائق ہوتا ہے۔ چاندنی رات میں ہم نے اس کے حسن سے خوب لطف اٹھایا۔

چاروں اَور سناٹا طاری تھا۔ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی تھی۔ وادیوں کے درخت ثمرآور ہو چکے تھے۔ کھیت بچوں کی ہنسی سے مہک رہے تھے، اور لوگ فرحاں و شاداں نظر آتے تھے، حتیٰ کہ گدھے بھی خوش نظر آ رہے تھے۔ صرف اسپارٹا کا علاقہ ہی اداس اور افسردہ سا نظر آ رہا تھا۔ آرکیڈیا پہنچ کر میں نے شکر ادا کیا۔ یہ سڈنی کے تخیل سے جنم لینے جیسا حسین مقام تھا۔ ٹائرنز میں ایک قدیم گرجا گھر کے نگران کو گلہ تھا کہ اس شاندار عمارت کی تزئین تو نہایت بھونڈے انداز میں کی گئی ہے۔ ڈیلفے میرے لئے متاثر کن تھا۔ جبکہ ایپے داروس اس سے کہیں بہتر اور خوبصورت مقام تھا۔ ہمارے وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد جرمنوں سے لدی ایک بس وہاں پہنچی۔ ان کی اچھی خاصی تعداد کے باوجود وہاں کے امن و امان میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ ہم وہاں تھیٹر میں بیٹھے ماضی کے زمانے کی سیر کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک حسین اور واضح آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ وہاں آنے والے جرمنوں میں اوپیرا کی ایک گلوکارہ بھی شامل تھی۔ ہماری طرح اس خوبصورت مقام کے سحر میں گرفتار ہو کر اس نے گانا شروع کر دیا۔ بہرحال مجموعی طور پر ان سیاحوں نے ہمیں اتنا پریشان نہیں کیا، لیکن امریکی فوج سے ہم خاصے تنگ ہوئے۔ ہر جگہ ان کے ٹرک موجود تھے۔ ایتھنز میں تو گویا ان کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ وہ اپنے مخصوص بھونڈے انداز میں اپنے مطالبوں کے لئے غل غپاڑہ مچا رہے تھے۔ ان کی

نسبت راہ چلتے یونانیوں کو ہم نے بات چیت میں زیادہ با اخلاق، ہنس مکھ اور ذہین پایا۔ ایتھنز کے باغوں میں انہیں اپنے بچوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے دیکھ کر ہمیں بہت خوشی محسوس ہوئی۔

یونان کی جانب یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اس لئے میرے لئے وہاں سب کچھ دلچسپی کا باعث تھا۔ البتہ ایک حوالے سے مجھے حیرت بھی ہوئی۔ ان کی عام کامیابیاں جنہیں وہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، سے واقف ہونے کے بعد میں ایک چھوٹے سے گرجا گھر میں پہنچا۔ یہ گرجا اس زمانے کی یادگار تھا جب یونان بازنطینی سلطنت کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ وہاں مجھے ایسا یک گونہ سکون سا ملا جو قبل از عیسائیت کی کسی اور عمارت میں نہ ملا تھا۔ البتہ یہ تاثر صرف احساس کی حد تک رہا، میرے عقائد تک نہیں پہنچ پایا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یونانی جدید دنیا سے اس لحاظ سے مختلف تھے کہ ان کے ہاں گناہ کا شعور نہ تھا۔ سو ایک حد تک حیرت کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ اعتقاد کے لحاظ سے نہ سہی لیکن احساس کی سطح پر ایک حد تک میں خود بھی اس شعور سے متاثر ہوں۔ بہر حال کچھ قدیم یونانی اشیا نے مجھے شدید طور پر متاثر کیا۔ ان میں سے مجھے سب سے زیادہ متاثر کرنے والی شے اولمپیا میں نہایت حسین اور ہمدرد دیوتا ہرمیز کے مجسمے تھے۔

1953ء میں، میں نے اور ایڈتھ نے تین ہفتے اسکاٹ لینڈ میں گزارے۔ راستے میں ہم وادیِ وی میں پہاڑی پر واقع وہ گھر بھی دیکھنے گئے، جہاں میری پیدائش ہوئی تھی۔ تب اس کا نام ریوان سکروفٹ ہوا کرتا تھا، اب اسے بدل کر کلیڈون ہال کر دیا گیا تھا۔ نظر آ رہا تھا کہ عمارت کی اچھی دیکھ بھال ہوتی رہی ہے۔ البتہ جنگ کے دوران اس کے باغ اور باغیچے بہت متاثر ہوئے تھے۔ میرے والدین اپنی وصیت کے مطابق اس عمارت سے جڑے باغ میں دفن کئے گئے تھے۔ البتہ بعد میں خاندان کی خواہش پر دونوں کو چینیز میں واقع خاندانی قبرستان میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ راستے میں ہم دونوں بر روڈیل میں سسی ٹولر کے مقام پر بھی گئے۔ 1893ء میں یہاں میں نے ریڈنگ پارٹی کے رکن کی حیثیت سے پانچ ہفتے گزارے تھے۔ اس پارٹی کو اب بھی یاد کیا جاتا تھا۔ وزیٹرز بک میں اس قصے کا تذکرہ بطور ثبوت موجود تھا، جو میں ایڈتھ کو سنا چکا تھا۔ یہ قصہ مس پیپر سے متعلق تھا، جو ایک بار وہاں ہم سے ملنے آئی۔ بعدازاں اس نے ذہنی نامی ایک آدمی سے شادی کر لی۔

اپنے آخری پڑاؤ، سینٹ فلنز پہنچنے پر میں نے استقبال کرنے والی خاتون کو جب بتایا کہ میں اس سے قبل میں 1878ء میں ایک بار یہاں آ چکا ہوں، تو اس نے حیرت سے کہا، "تب تو آپ ایک چھوٹے بچے ہوں گے!" اتنے برس بعد بھی مجھے سینٹ فلنز کی کئی چیزیں اچھی طرح یاد تھیں۔ جیسے دریا پر بنا ہوا لکڑی کا پل، اس کے علاوہ ہوٹل سے ملحقہ 'نیش' نامی گھر اور ایک کھاڑی مجھے یاد تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ کھاڑی سورج سے خشک ہونے والی ان جگہوں میں شامل ہے جن کا ذکر دعاؤں کی کتاب میں ملتا ہے۔ میں پورے پچھتر برس بعد وہاں موجود تھا۔ لہٰذا اس سے ایک طرح میرے حافظے کی صحت تو ثابت ہوئی۔ بہر حال، سینٹ فلنز میں ہم نے ڈھیر ساری سیریں کیں۔ کبھی کبھار تو ہم صرف چھکڑوں کی پٹڑی پر ہی چلے جاتے۔ پیدل بھی بہت گھومے۔ وہ سیریں ہماری سہانی یادوں کا حصہ بن چکی ہیں۔ ایک بار ہم ایک پہاڑی پر چڑھ رہے تھے تو ایک ہرنی اور اس کا بچہ چوٹی پر نظر آئے۔ دونوں ہماری جانب آتے دکھائی دیتے تھے۔.......... ہم موٹر پر گلینو کی اداس وادی سے ہوتے ہوئے سینٹ فلنز کی جانب واپس ہوئے۔ یہ علاقہ اس قدر گہری خاموشی اور دکھ کا مارا لگتا تھا گویا ابھی یہاں کوئی قتلِ عام ہوا ہو۔

دو برس بعد ہم دوبارہ سینٹ فلنز گئے۔ البتہ اس بار وہاں ہمارا وقت پہلے کی طرح ہنسی خوشی میں اور ہر فکر سے آزاد نہ گزرا۔ راستے میں ہمیں گلاسکو میں رکنا پڑا۔ وہاں مجھے روتھر گلین کے لئے لیبر پارٹی کے امیدوار کے حق میں تقریر کرنا تھی۔ یہ موصوف عالمی حکومت کے سرگرم کارکن تھے۔ گلا خراب ہونے کے باعث میں اس سے کنی کترانے کی کوشش کرتا رہا۔ کافی عرصے سے اس کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی چیز سہی طرح سے کھانے اور چبانے میں مشکل پیش آتی تھی۔ میں اکثر استہزا کے طور پر کہتا ہوں کہ میرے گلے میں یہ خرابی، سیاستدانوں کے خراب بیانات کو ہضم کرنے کی کوششوں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ خیر، اس تکلیف سے کہیں زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ میرا بیٹا ان دنوں شدید علیل ہو گیا تھا۔ سو اس برائے نام تعطیل کے دوران ہم اس سے متعلق پریشانی میں مبتلا رہے۔ ہمیں اس کے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی فکر بھی ستائے جا رہی تھی جو اُن دنوں تقریباً ہماری ہی ذمہ داری میں تھے۔ بعد ازاں، اس کی صحت یابی کے بعد بھی وہ ہمارے پاس ہی رہے۔

ایڈتھ کے نام ایک نظم

برسوں میں نے
سکھ، چین کو ڈھونڈا ہے
خوشی کا، غم کا
مزہ بھی چکھا ہے
جنوں سے اکثر
میرا پالا پڑا ہے
تنہائی کا روگ سہا ہے
دل کو کچلنے والے
اکلاپے کا درد بھی جھیلا ہے

اب جب عمر کی نقدی پوری ہونے کو آئی ہے
تنہائی کے لمبے سفر کے بعد
تمہارا ساتھ ملا ہے
اِس ساتھ نے مجھ پہ
سکھ کا سایہ ڈالا ہے
عمر کے آخری حصے میں
میں نے پھر سے جانا ہے
محبت کا نشہ سب سے سہانا ہے
اسی سے جیون کا تانا بانا ہے

اب جب اس جہاں سے جاؤں گا
خوشی سے کہتا جاؤں گا......
کوئی ارمان نہیں باقی
میں نے جیون خوب جیا ہے!
میں نے جیون خوب جیا ہے!

آخری بات

لڑکپن کے بعد میری زندگی کا سنجیدہ حصہ دو مقاصد کے لئے وقف رہا۔ ہر دو مقاصد ایک عرصے تک الگ الگ ہی رہے، صرف آخری چند برسوں میں یہ ایک ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا اس دنیا میں (کلی طور پر) کسی چیز کے علم کا حصول ممکن ہے؟ دوسری جانب میں ایک پرسکون اور مطمئن دنیا کی تخلیق کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کا خواہش مند تھا۔ اڑتیس برس کی عمر تک میں نے اپنی زیادہ تر توانائیاں پہلے مقصد کے حصول پر صرف کیں۔ تشکیک پسندی میرے لئے سکون کا باعث نہ تھی۔ جس کے باعث میں اس نتیجے پر پہنچا کہ علم کا ایک بڑا حصہ شک و شبے سے بالاتر نہیں۔ لوگ جس طرح مذہبی اعتقاد رکھتے ہیں، میں ایسے ہی یقین کی جستجو میں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ریاضی میں اس یقین کی تلاش زیادہ سہل ہوگی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرے استاد مجھے ریاضی کے عمومی ثبوت قبول کرنے پر مجبور کرتے، جو مغالطوں سے بھرے ہوتے۔ جس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یقین نے اگر ریاضی میں ہی ملنا ہے تو وہ کوئی اور ہی قسم کی ریاضی ہوگی۔ مستحکم بنیادوں کی حامل نئی ریاضی!

بہر حال، جیسے جیسے کام کی رفتار کے ساتھ ساتھ مجھے ہاتھی اور کچھوے کا قصہ یاد آتا رہا۔ ایسا ہاتھی بنانے کے بعد، جس پر ریاضی کو بٹھایا جا سکے، میں نے دیکھا کہ بے چارا ہاتھی ڈگمگا رہا ہے۔ سو میں نے ہاتھی کو گرنے سے بچانے کے لئے کچھوا بنانا شروع کر دیا۔ مگر وہ بھی ہاتھی سے زیادہ مستحکم ثابت نہ ہوا۔ یوں لگ بھگ بیس برس کی مسلسل کوششوں کی بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ریاضی کو شک و شبے سے بالاتر کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ پھر پہلی عالمی جنگ نے میرے تمام خیالات کا مرکز انسانی مصائب اور حماقت کو بنا دیا۔ میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں، یعنی انسانی مصائب اور حماقتیں انسان کا لازمی مقدر نہیں ہیں۔ انسان ان سے نجات پا سکتا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ

ذہانت، تحمل اور خوش مزاجی سے انسان آج نہیں تو کل تمام خود ساختہ اذیتوں سے نجات حاصل کر لے گا۔ تشویش کی بات البتہ یہ ہے کہ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے وہ کہیں خود کو تباہ نہ کر لے۔

اس یقین کے سبب میں ہمیشہ ایک خاص حد تک رجائیت پسند رہا ہوں۔ یہ اور بات کہ ڈھلتی عمر کے ساتھ اب وہ پہلی سی امید پرستی باقی نہیں رہی۔ اس میں اب کچھ ٹھہراؤ سا آ گیا ہے۔ اس کے باوجود میں ان لوگوں سے آج تک اتفاق نہیں کر سکا جو یہ سمجھتے ہیں کہ دکھوں کو سہتے رہنا انسان کا مقدر ہے۔ نیز یہ کہ اس سے نجات ناممکن ہے۔ ماضی اور حال کے تقابل میں دکھ اور مصائب کی وجوہات کو جاننا اتنا مشکل نہیں۔ ماضی میں مفلسی، بیماریاں اور قحط انسانی مصائب کا بنیادی سبب ہوا کرتے تھے۔ یہ مصائب، فطرت پر انسانی کی ناکافی دسترس کا کا نتیجہ تھے۔ دوسری طرف جنگوں، انسانی قتلِ عام اور جبر و تشدد کا دور دورہ رہا ہے، جس کا سبب انسانوں کی ایک دوسرے سے نفرت ہے۔ اسی طرح انسانوں نے غیر صحت منداور بے ثمر مذاہب بھی قبول کیے، جو نہ صرف اندرونی کشمکش کا سبب بنتے بلکہ دنیاوی مسرتوں کو بھی بے معنی بنا دیتے۔ یہ تمام مصائب ناگزیر نہیں ہیں۔ اب ایسے طریقے دریافت کر لئے گئے ہیں جن سے ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ جدید دنیا میں اگر افسردہ اور بے خوش معاشرے ہیں تو اس کا سب ان کی جہالت، ایسی عادتیں، عقائد اور جذبے ہیں جو انہیں اپنی مسرتوں بلکہ زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ اس خوفناک عہد میں، میں نے ایسے کئی لوگ دیکھے جو دکھ اور موت سے محبت کرتے ہیں۔ نجات کی امید انہیں بھڑکا دیتی ہے۔ امید ان کے لئے ایک غیر معقول امر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حالات سے متعلق کا ہلانہ مایوسی کا شکار ہو کر وہ حقائق کا سامنا کر رہے ہیں۔ میں اس سے قطعاً اتفاق نہیں کرتا۔ اس دنیا کو قائم رکھنے کے لئے ذہانت اور توانائی کی ضرورت ہے۔ اس لئے افسردگی کے مارے لوگ اکثر توانائی سے محروم ہوتے ہیں۔

میری زندگی کا آخری نصف حصہ، تاریخ کے دردناک ادوار میں سے ایک اہم موڑ میں گزرا۔ دنیا کے حالات پہلے سے زیادہ بدتر ہوئے۔ حتمی محسوس ہونے والی ماضی کی کئی اہم کامیابیاں، عارضی ثابت ہوئیں۔ میرے عہدِ جوانی میں وکٹوریائی رجائیت کو عمومی قبولیت حاصل تھی۔ یہ خیال عام

تھا کہ ایک منظم عمل کے ذریعے آزادی اور خوشحالی کو بتدریج دنیا بھر میں پھیلا دیا جائے گا۔ سب کو یہ یقین تھا کہ یوں جبر و تشدد، آمریت و ناانصافی کا خاتمہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس زمانے میں کوئی عالمی جنگوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شاید ہی کوئی شخص انیسویں صدی کو ماضی اور مستقبل کی بربریت کا مختصر درمیانی وقفہ سمجھتا ہو۔ جو لوگ اس ماحول میں پروان چڑھے، ان کے لئے آج کی دنیا کو قبول کرنا مشکل رہا ہے۔ انہیں نہ صرف جذباتی بلکہ ذہنی کوفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جن خیالات کو کافی سمجھا جاتا تھا، وہ ناکافی رہے۔ کئی حوالوں سے آزادی کے پہلو کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ بعض دیگر حوالوں سے، بالخصوص قوموں کے باہمی تعلقات کے ضمن میں، ماضی میں جن آزادیوں کی قدر کی جاتی تھی، وہ تباہی و بربادی کا ذریعہ بن گئیں۔ ہماری دنیا کو موجودہ خطرناک صورتحال سے نجات حاصل کرنے کے لئے نئے خیالات، نئی امیدوں، نئی آزادیوں اور نئی پابندیوں کی ضرورت ہو گی۔

مجھے یہ زعم نہیں کہ سماجی اور سیاسی معاملات کے حوالے سے میں نے کوئی عظیم الشان جدوجہد کی ہے۔ شاندار نتائج حاصل کرنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ مذہبی اور حاکمانہ قسم کے طریقے استعمال کئے جائیں، جیسے کہ ہمارے عہد میں کمیونزم نے استعمال کئے ہیں۔ بہر حال، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے نہیں لگتا کہ انسانیت کو مزید کسی مذہبی قسم کے نظریے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح میں انسانی زندگی کے محض کسی ایک پہلو سے تعلق رکھنے والے کسی جزوی نظریے کو بھی قبول نہیں کرتا۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہر چیز کا انحصار اداروں پر ہے۔ اس لئے اچھے ادارے خود ہی اس زمین کو جنت بنا دیں گے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دلوں میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اداروں سے کچھ نہ ہو گا، ہمیں خود کو بدلنا ہو گا۔ میں ہر دو نقطۂ نظر سے کلی طور پر اتفاق نہیں کرتا۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ادارے کردار کی تشکیل کرتے ہیں اور کردار اداروں کو تبدیل کرتے ہیں۔ لہٰذا دونوں میں ایک ساتھ اصلاح ہونی چاہئے۔ علاوہ ازیں اگر افراد کی ترقی کی جانب پیش قدمی اور لچک اس حد تک ضروری ہے، جتنا میں سمجھتا ہوں تو پھر انہیں ایک ہی سانچے میں ڈھالنا ممکن نہ ہو گا۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کو ایک ہی فوج کا سپاہی نہیں بنا دینا

چاہئے۔تنوع اور رنگا رنگی، زندگی کا ناگزیر حصہ ہے۔گو کہ اسی وجہ سے کوئی ایک عقیدہ عالمگیر مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔کٹھن حالات میں اس قسم کے عقیدے کا پرچار مشکل ہوتا ہے، اور وہ شاید تب تک موثر بھی نہیں ہوتا جب تک کہ المیاتی تجربے کے ذریعے چند سبق حاصل نہ کر لئے جائیں۔

میرا کام اب خاتمے کے قریب ہے۔اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس کا مجموعی طور پر جائزہ لے سکتا ہوں، کہ میں کس حد تک کامیاب اور کس حد تک ناکام ہوا۔شعوری عمر سے ہی میں نے خود کو عظیم اور کٹھن کاموں کے لئے تیار کر لیا تھا۔پون صدی پہلے کی بات ہے کہ مارچ کی ٹھنڈی اور تیز دھوپ میں ٹائرگارٹن کی پگھلتی ہوئی برف پہ اکیلے مٹر گشت کرتے ہوئے میں نے دو قسم کی کتابیں لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔میرا خیال یہ تھا کہ پہلی قسم کی کتابیں تجریدی ہوں گی اور پھر رفتہ، رفتہ وہ واضح ہوتی چلی جائیں گی۔دوسری قسم کی کتابیں وہ ہوں گی جو شروع میں واضح ہوں اور پھر آگے چل کر آہستہ آہستہ تجریدی ہوتی چلی جائیں گی۔ان کا انجام اس ترکیب پر ہوگا جو خالص نظریے کو عملی سماجی فلسفے سے ملا دیں گی۔گو کہ میں اس حتمی ترکیب تک نہیں پہنچ پایا لیکن میں نے دونوں قسم کی کتابیں ضرور لکھیں۔قارئین نے انہیں پسند کیا اور ان کی تعریف کی۔ان کتابوں نے مرد و زن کی ایک کثیر تعداد کے خیالات پر اثرات ڈالے، اس حد تک میں ضرور کامیاب رہا ہوں۔

یہ کامیابیاں اپنی جگہ، لیکن مجھے دو قسم کی ناکامیوں سے بھی پالا پڑا۔ان میں اسے ایک کی نوعیت خارجی ہے اور ایک کی داخلی۔

پہلے خارجی ناکامی کی بات کرتے ہیں۔ٹائرگارٹن اب ویران ہے۔برانڈن برگر ٹور جہاں سے میں مارچ کی اس یادگار صبح کو یہاں داخل ہوا تھا، اب دو دشمن ممالک کی سرحد بن چکا ہے، جو جنگلے کے آر پار ایک دوسرے کو خونی نظروں سے گھورتے رہتے ہیں۔اور انسانیت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔کمیونسٹوں اور فسطائیوں نے ان تمام چیزوں کو چیلنج کیا ہے، جنہیں میں اچھا سمجھتا تھا۔انہیں ناکام بنانے کی کوششوں میں ان کے مخالفین ایسی بہت سی خوبیوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، کہ جن کی حفاظت کا دعویٰ لے کر وہ میدان میں اترے تھے۔سو اب آزادی کو کمزوری سمجھا

جانے لگا ہے۔ رواداری، چالبازی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ پرانے آدرش فرسودہ قرار دے کر مسترد کئے جاچکے ہیں۔ جب تک کسی نظریے میں کرختگی نہ ہو، اسے قابلِ احترام نہیں سمجھا جاتا۔

اب رہی بات میری داخلی ناکامی کی، تو دنیا کے لئے وہ اہم ہو یا نہ ہو، میری زندگی کو اس نے مسلسل بے سکون کئے رکھا۔ میں نے افلاطون کی ابدی دنیا میں تقریباً مذہبی ایقان کے ساتھ آغاز کیا تھا۔ اس دنیا میں ریاضی سورج کی چمکیلی کرنوں کی مانند ہے۔ یہ آغاز تھا، اور انجام یہ ہے کہ میں اس ابدی دنیا کو اب بے کار اور غیر ضروری سمجھنے لگا ہوں۔ نیز ریاضی سے متعلق میری رائے اب یہ ہے کہ یہ ایک ہی چیز کو مختلف اعداد میں بیان کرنے کا ہنر ہے۔ میں نے زندگی کا سفر اس ایقان کے ساتھ شروع کیا تھا کہ ایک آزاد اور باحوصلہ محبت، لڑے بغیر دنیا کو فتح کر سکتی ہے، لیکن میرا انجام ایک تلخ اور خوفناک جنگ کی حمایت پر ہوا ہے۔ یہ سب میری ناکامیاں ہیں۔

بہرکیف، ناکامی کے اس بھاری احساس کے باوجود آج بھی ایک چیز ایسی ہے، جسے میں اپنی جیت ہی سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے میں نے نظری سچائی کو صحیح طور پر نہ سمجھا ہو، اسے غلط انداز میں دیکھا ہو۔ لیکن میرا یہ یقین غلط نہ تھا کہ اس قسم کی سچائی وجود رکھتی ہے، اور وہ ہماری عقیدت اور جستجو کے لائق بھی ہے۔ آزاد اور پرسکون انسانوں کی جانب جانے والی راہ کو میں نے شاید سہل اور مختصر جانا ہو، جو کہ وہ نہیں ہے۔ لیکن میں یہ اعتقاد رکھنے میں غلط نہ تھا کہ ایسی دنیا ممکن ہے، اور اس کی تعبیر کی جدوجہد میں ساتھ رہنا، قابلِ قدر ہے۔

سو میں نے ایک ایسے خواب کے پیچھے دوڑتے ہوئے زندگی گزاری ہے جو نجی بھی تھا اور سماجی بھی۔ نجی طور پر اس کا تعلق حسن، شائستگی اور عظمت کی پاسداری سے ہے۔ اجتماعی سطح پر اس کا تعلق تخیل کی حد تک اس سماج کو آباد رکھنے سے ہے، جس کی تخلیق ابھی ہونی ہے۔ یعنی ایک ایسا سماج جہاں افراد مکمل آزادی سے لطف اندوز ہو سکیں گے، جہاں نفرت، لالچ اور کینہ پروری کا وجود نہ ہوگا، کیونکہ انہیں قائم رکھنے اور جنم دینے والے عوامل کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

میں آج بھی اس خواب کی ممکنہ تعبیر پر یقین رکھتا ہوں۔ دنیا اپنی تمام تر وحشتوں اور تباہیوں کے باوجود مجھے اس یقین سے متزلزل نہیں کر پائی۔

رسل کے افکار

• ہر قسم کے عمل کا مقصد بنی نوع انسانی کی مسرت ہونا چاہئے۔

• حالات پہ قابو پانا دعاؤں یا عاجزی سے نہیں بلکہ سائنسی علم سے ہی ممکن ہوتا ہے۔

• تعصب پرستی بالآخر جنگ و جدال پہ ہی منتج ہوتی ہے۔

• کوئی بھی شخص برائی سے آشنا ہوئے بغیر قابلِ احترام نہیں ہوسکتا۔

• زندگی، خوشی، اور حسن، گرد آلود موت سے بہتر ہیں۔

• ہر اہم چیز، سادہ ہوتی ہے۔

• مالی مدد مانگنا ہمیشہ ہی ناگوار اور کراہت آمیز کام ہوتا ہے۔

• انسانی بقا، نظریات سے زیادہ اہم ہے۔

• ظلم کے خلاف مزاحمت ناگزیر ہے۔

• ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی ظلم کے فروغ کا باعث بنتی ہیں۔

• میں جھوٹ کے سہارے دانا بننے کی بجائے، سچائی کے ہاتھوں سودائی بننے کو ترجیح دوں گا۔

• ہر کام کی طرح کتاب میں بھی نقطہ نظر کی وحدت ہونی چاہئے۔

• عدم تشدد کا طریقہ کار وہیں کامیاب ہوسکتا ہے، جہاں فریقِ ثانی میں چند انسانی خوبیاں بھی موجود ہوں۔

• فرد کی آزادی اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی، جب تک وہ اپنے پسندیدہ طرزِ حکومت کی وکالت نہ کر سکے۔

• بعض نصب العین باغیانہ قسم کے ہوتے ہیں، انہیں صرف جنگ یا انقلاب سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

• جب کوئی شخص اپنے مستقبل کے خوابوں کی جانب پہلا قدم اٹھاتا ہے تو عموماً اسے خبطی اور سودائی ہی سمجھا جاتا ہے۔

• جمہوریت میں بہرحال ایک یقینی خوبی تو ہے، کہ پارلیمنٹ کا رکن اپنے حلقے کے ووٹرز سے زیادہ احمق نہیں ہوسکتا، کیونکہ لوگ احمق ہوں گے تبھی تو اسے اپنا نمائندہ منتخب کریں گے۔

• سمندر، ستارے اور سنسان مقام کی ہوائیں میرے لئے، میری محبوباؤں سے بھی زیادہ اہم رہے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ انسانی محبت دراصل میرے لئے خدا کی لاحاصل تلاش سے فرار کی ایک کوشش ہے۔

• لکھنے والا اگر جانبدار اور متعصب نہ ہو تو وہ دلچسپ تاریخ کیونکر لکھ سکتا ہے۔ یہ بات ازخود قابلِ توجہ ہے کہ کیا کوئی ایسا شخص ہوسکتا ہے جو ہر قسم کے تعصب اور جانبداری سے پاک ہو؟! اگر کوئی شخص اس معیار پر پورا اترنے کا دعویٰ رکھتا ہے، تو میں اسے صرف سفید جھوٹ ہی کہوں گا۔

• کوئی شخص مکمل طور پر تعصّبات سے پاک نہیں ہوتا، اس لئے وسیع پیمانے کی تاریخ لکھتے ہوئے بہتر یہی ہوگا کہ مصنف اپنی جانبداری کا خود ہی اعلان کردے۔ جو قارئین اس سے متفق نہ ہوں اور کسی اور قسم کا تعصب چاہتے ہوں، ان کے لئے یہ سہولت ہوگی کہ وہ دیگر مصنفین سے رجوع کر لیں۔ اس سارے قضیئے میں یہ معاملہ آنے والی نسلوں پہ چھوڑ دینا چاہئے کہ کون سا تعصب سچائی کے زیادہ قریب ہے۔

• قانون اور قید کے ذریعے فحاشی سے نمٹنے میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔ اس سے چیزوں سے متعلق کشش پیدا ہوجاتی ہے۔ بے کار اور گھٹیا درجے کی اشیا بھی دلفریب لگنے لگتی ہیں۔ اس لئے فحش نگار کو جیل میں ڈالنے کی بجائے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔

سیاسی قیدیوں سے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے۔ جب کسی شخص کو اس کے سیاسی نظریات کے باعث جیل میں ڈالا جاتا ہے، تو عوام میں اس کے نظریات کے لیے دلچسپی اور کشش پیدا ہوجاتی ہے۔ گو کہ حکام بعض خیالات کو پھیلنے سے روکنے کے لئے ان کا پرچار کرنے والوں کو پسِ زندان ڈال دیتے ہیں۔ مگر اس کے نتیجے میں خیالات رکنے کی بجائے مزید تیزی سے پھیلنے لگتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے انسانی مصائب میں اضافہ ہوتا ہے اور تشدد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔